قریۂ احساس
شعیب جاذب

''قریۂ احساس'' آنسوؤں کی جھیل سے
اُبھرتے ہوئے شاعر کا روشن چہرہ ہے۔
ڈاکٹر اقتدار ضیغم۔ لاہور

'قریۂ احساس' مزاحمتی غزل کا آئینہ ہے۔
شاہین زیدی
(ایڈیٹر سہ ماہی ''نوادر'' لاہور)

''قریۂ احساس'' جدید لب ولہجہ کے صاحب
اسلوب شاعر شعیب جاذبؔ کی نئی غزلیات کا مجموعہ ہے۔
اس میں مزاحمتی ادب کے ساتھ اظہار کا منفرد انداز بھی
نمایاں ہے۔ ان کے ہاں عصری آگہی اور جدید طرزِ احساس
کی آمیزش سے نیا شعری اسلوب وجود میں آیا ہے۔
بلاشبہ پاکستان کے جدید شعری منظرنامے میں شعیب
جاذبؔ کا نام سنہری الفاظ میں لکھے جانے کے لائق ہے۔
محمد جمیل اختر قریشی
(ڈی۔او۔ کالجز ضلع لیہ)

اکیسویں صدی کا پاکستانی اور عالمی معاشرہ انسانی
وجود اور بقا کے لیے جو مسائل لے کر طلوع ہوا ہے اس کا
شعری منظرنامہ شعیب جاذبؔ نے ''قریہ احساس'' کی
شکل میں تخلیق کیا ہے۔

اقبال مجیدی۔ کراچی

''قریۂ احساس'' شعیب جاذبؔ کا تیسرا
مجموعۂ غزل ہے۔ انھوں نے غزل کو معاصر طرزِ احساس
میں سمو کر اپنا شعری آہنگ تخلیق کیا ہے۔ انھوں نے
لطیف لفظیات کو اس خوبی سے برتا ہے کہ اُن کے شعر دل
میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

شفقت حسین سبزواری
(ایڈیٹر ماہنامہ ''پیاسِ گل'' لاہور)

قریۂ احساس

شعیب جاذبؔ

اظہار سنز
19۔اردو بازار لاہور فون: 7230150
ہیڈ آفس: 9۔ ریٹی گن روڈ لاہور فون: 7220761
E-mail: izharsons_2004@hotmail.com
www.izharsons.com

باہتمام

سید کوثر حسین بخاری
پروفیسر مہر اختر وہاب

ضابطہ

کتاب ---------------------- قریۂ احساس
شاعر ---------------------- شعیب جاذب
کمپوزر 315034----0334-6941519 یونس خان بزدار
تاریخِ اشاعت ---------------------- مارچ 2007ء
سرورق ---------------------- علی اعجاز نظامی
(آرٹسٹ) وحید بلڈنگ ملتان
پبلشر ---------------------- اظہار سنز 19، اُردو بازار لاہور
قیمت ---------------------- 160 روپے
برائے رابطہ ---------------------- ناز سینما روڈ لیہ
0333-7512994 -----0334-6974007

انتساب

نقد وجرح

رختِ قلم

منفرد اسلوب کا شاعر

ڈاکٹر خیال امروہوی

تنقید وہ کسوٹی ہے جس پر غالب سے لے کر جوش ملیح آبادی تک کی قد آور شخصیتوں کو پرکھا جا سکتا ہے، یہی وہ میزان ہے جس میں ہم فن اور فنکارانہ صلاحیتوں کو تول سکتے ہیں یہی وہ فن ہے جس کے بغیر کسی بھی تحقیقی اور تخلیقی محاسن اور معائب کو سمجھنا مشکل ہے۔ اگر یہ مفروضہ قابل قبول ہے تو آیئے! اسی کی روشنی میں ہم شعیب جاذؔب کے کلام کا جائزہ لیں۔ کسی بھی شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کو سمجھنے سے قبل ہمیں اس کے مزاج اور اس کے داخلی وخارجی محرکات کو سمجھنا ہوگا۔ اس سلسلے میں شعیب جاذؔب صاحب وہ منفرد صاحبِ اسلوب شاعر ہیں جنہوں نے آزادنگاہی اور حقیقت پسندی کی عینک لگا کر اپنے پس و پیش کا جائزہ لیا۔ سماج کے داخلی وخارجی محرکات کو سمجھا اور پھر اسے اپنے مزاج کی رنگارنگی کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ مزاج سے میری مراد Theam ہے جس نے ان سے ایسے شعر کہلوائے جو قاری سے زیادہ سامع کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ان کے یہاں زندگی برہنہ انداز میں جلوہ گر ہے وہ زندگی کے حقائق کی نمائندگی کے سلسلے میں کسی مخصوص ''مکتب فکر'' کے مرہونِ منت نہیں وہ جس انداز سے سوچتے ہیں اسی انداز سے من وعن بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

اظہارِ فکر کے معاملے میں انہوں نے اپنے گرد پھیلے ہوئے زمان ومکان کی اشیاء کو بطور علامت استعمال کیا ہے اور اس سلسلے میں وہ تجرید (TRACTION)

کی ہر اس خندق کو پھلانگ گئے ہیں۔ جس کا عبور کرنا، دوسروں کے لیے ایک مسئلے سے کم نہیں ہے۔

تجریدی زاویہ اظہار نے ان کے اشعار میں مخصوص اسلوب پیدا کر دیا ہے جس سے وہ اپنے مزاج کی روشنی میں دست بردار ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے اور نہ انہیں ہونا چاہیے تا حال میں نے ان کی جتنی غزلیں تنقیدی نگاہ سے مطالعہ کیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور اس سماج کی طبقاتی کشمکش اور تضادات نے ان کے ذہن وفکر پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ جاذب صاحب میں سماج کو جھنجھوڑنے اور اس کی گونا گوں اور بوقلموں اقدار پر پے در پے وار کرنے کی زبردست جسارت موجود ہے۔

شعیب جاذبؔ نے اپنی نئی تراکیب اور استعارات کے ذریعے ''تجسم'' پیدا کرنے کی نئی راہ اختیار کی ہے، ممکن ہے قدامت پسند اہلِ سخن جاذب صاحب کی تجریدی اپج کو محلِ نظر سمجھیں، لیکن یہ لازمی نہیں کہ ہر شاعر رجعت پسندوں کی خاطر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دے بلکہ اب قدامت پرستوں کو چاہیے کہ وہ نئی نسل کی تراش وخراش کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

شعیب جاذبؔ نے اپنی تخلیقات میں ان تمام مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ جنہیں اکثر بزعم کمیونسٹ شاعر عجز واظہار کی وجہ سے ادا نہیں کر سکے حالانکہ جاذب صاحب کا کسی مکتبۂ فکر سے تعلق نہیں ہے اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو جاذب کی شاعری میں ہماری سماجی زندگی مرغ بسمل کی طرح تڑپتی دکھائی دے گی اور یہی اسلوب رجعت پسندوں کو اپنی بے مایہ اور چیتھڑا تہذیب پر چار آنسو بہانے کی دعوت

دے سکتا ہے۔

یاس کی پرچھائیوں کو دور کرنے کے لیے
قہقہوں کا نقرئی غازہ کوئی ملتا رہا
حادثوں کا وار بھی کتنا اذیت ناک تھا
میری گردن پر درانتی کی طرح چلتا رہا

یوں تو ہر شاعر اپنی کتھا سنا کر دوسروں کو متاثر کرتا چلا آیا ہے لیکن شعیب جاذب نے اپنی بدحالی کا رونا صرف اپنی ذات کے لیے نہیں رویا بلکہ انہوں نے اس دور کے اصناف کی نمائندگی کی ہے۔

میں ثمردار شاخ ہوں جاذب
اپنے ہی بوجھ سے خمیدہ ہوں

شعیب جاذب نے اپنی شاعری میں جو اسلوب پیدا کیے وہ بہت ہی زیادہ پر تاثیر ہیں ان میں ہماری قومی زندگی جھلکتی ہے صرف ان کی مروجہ اصطلاحات نت نئی تصویریں بناتی چلی جاتی ہیں۔ جنہیں ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے یہاں فارسی اور عربی کا بہت عمل ودخل ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب عوامی ہے اور عوام کے لیے سہل فہم ہے۔

اپنے جوڑے ہیں ستاروں کا جڑاؤ کر کے
آج شرمانے لگی جھیل بھی دلہن کی طرح

شعیب جاذب نے غالباً لاشعوری طور پر بہت سی باتیں ایسی کہہ دی ہیں جن کا عصری تقاضوں سے انطباق ہوسکتا ہے! عصری تقاضوں سے مراد سماج کی وہ

شکست وریخت ہے جو سیاسی اور اقتصادی توازن کی وجہ سے رونما ہو رہی ہے۔

سرِ ساحل ہوئی تعمیر جس کی وہ گھروندا ہوں
مری تو ہر گھڑی دریا کی طغیانی پہ نظریں ہیں

جاذب صاحب کے یہاں سچائی کی حمایت اور کذب و دروغ کی نفی جگہ جگہ موجود ہے جو انہیں عصرِ حاضر کے حق گو شعراء میں منفرد مقام پر پہنچا سکتی ہے۔

صداقتوں کے تحفظ میں سخت بولیں گے
ہوئے جو نرم بھی لہجے کرخت بولیں گے

ان کے یہاں عوامی انصاف یا افسر شاہی کی جرائم نوازی کا بھی بے پناہ احساس موجود ہے جو آج کی شاعری کا جز ولاینفک بن چکا ہے۔

جو رہزنوں نے سرِ عام آ کے لوٹ لیے
عدالتوں میں وہی ساز و ورخت بولیں گے
زبان کٹ بھی گئی انگ انگ چھلکے گا
میں گنگ ہو بھی گیا لخت لخت بولیں گے

شعیب جاذبؔ صاحب کے یہاں جو لہجہ پایا جاتا ہے وہ ان کے جدید معاصر شعراء سے مختلف ہے اس لیے لہجے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پس منظر میں روایتی انداز موجود نہیں ہے، دار و رسن، زندان و زنجیر ہوا کا شور اور وحشت نا کی کے وہ تقاضے نہیں ہیں جو ہماری روزمرہ کی شاعری کا جزو بن چکے ہیں بلکہ اس لہجے کے ساتھ ہی نئی بات، نئی اپج، نئی کیفیت اور تازگی اظہار کا احساس ہوتا ہے۔

کس قدر بوڑھی صدی پر بوجھ ہیں
اکھڑی سانسیں ہانپتے لمحات کی

ایسا کمسن قہقہہ بھی میں نے دیکھا ہے جسے
جھولنے کو آپ کے ہونٹوں کا گہوارہ ملا

قہقہہ رس بھرا سہی لیکن
نخلِ ہستی کا اس کو پھل نہ بنا

شعیب جاذبؔ نے اُردو شاعری کو منفرد لہجہ دیا ہے انہوں نے اپنے (Diction) پر قدرت حاصل کرنے کے لیے بڑی ''تپسیا'' کی ہے۔ان کے شعروں میں صرف ذخیرہ الفاظ اور نئی تراکیب ہی کی کارفرمائی نہیں بلکہ انہیں ابلاغ پر بھی قدرت حاصل ہے۔

جاذبؔ کے اشعار میں مضامین اور معانی کی فراوانی ہے اور ان عوامل پر تغزل نے اس مئے یک آتشہ کو دوآتشہ اور سہ آتشہ کر دیا ہے۔

صرافِ چمن ہی مجھے پہچان سکے گا
شبنم کی طرح گل کی انگوٹھی میں جڑا ہوں
خود آئے گا چل کر کبھی دیوار کا سایا
اس آس پہ میں دھوپ کے آنگن میں کھڑا ہوں

جاذبؔ صاحب کی شاعری کی انفرادیت، انتخاب الفاظ سے بھی ہے وہ کسی

بھی شعر کو ''سپاٹ'' انداز میں نہیں کہتے ہر مصرع میں دو یا دو سے زائد ایسے تشبیہ اور استعاراتی جملے ادا کرنے کے عادی ہیں جن سے مصرع مسجّع ہو جاتا ہے، قوافی اور ردیف کے انتخاب میں بھی ان کی مہارت دکھائی دیتی ہے۔ وہ پامال قوافی اور ردیفوں میں شعر نہیں کہتے بلکہ ہر غزل میں ان کے یہاں انتخاب اور تخلیقی صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔

میرے ماتھے پر غریبی کا نشاں دیکھے کوئی
تیر کا جیسے نشاں مشکیزۂ عباس پر

یہ تو گرداب ہے معصوم کا جھولا تو نہیں
لہر کیوں سینے پہ کرتی ہوئی ماتم اُٹھی

لاوا دلِ غریب سے پھوٹا ہے اس طرح
ٹکرا گئے ہیں جھونپڑے شاہوں کے کاخ سے

جاذبؔ اک عمر سے ہے مری سانس گھات میں
میں جی رہا ہوں دشمنِ جانی کے باوجود

بہر حال اس عصرِ قحط الشعراء میں لیہ جیسی سنگلاخ سرزمین میں شعیب جاذب جیسا دلیر، بانکا، صداقت مآب، تخلیق کار، ذی وقار اور ہوشیار شاعر پیدا ہونا عجوبے سے کم نہیں ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سرائیکی ''وسیب'' کا ادیب

ڈاکٹر صاحبزادہ سلطان الطاف

سرائیکی ادب، ادیب، شاعر اور اُن کے معاشرہ میں مٹھاس، درد، سوز اور رقت پائی جاتی ہے۔ اسی زبان و دیار کے باسی شعیب جاذبؔ لیہ میں اپنے توانا جذبات کے ساتھ قومی زبان اُردو میں نغمہ سرا نظر آتے ہیں۔

سرائیکی معاشرہ میں کشتۂ سیادت و سیاست کے عمومی افکار و پکار کے مطابق اُن کے ہاں یاسیت کا سماں ملتا ہے۔ ذرا گہرائی سے دیکھیں تو کہیں کہیں اُمید کی رمک و دمک بھی زوزنِ دیوار سے چہرہ نمائی کرتی ہے۔

خود آئے گا چل کر کبھی دیوار کا سایہ
اس آس پہ میں دھوپ کے آنگن میں کھڑا ہوں

شعیب جاذبؔ کی شاعری میں ایک عجیب رنگ نظر آیا ہے وہ پہلے مصرعہ میں کیفیت حال بیان کیا کرتے ہیں اور دوسرے مصرعہ میں وجہ کیفیت بتاتے ہیں۔ اس قسم کا انداز فارسی کے معروف شاعر نظیری نیشاپوری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

شعیب جاذبؔ لیہ میں ادبی محفلوں اور ادبی اداروں کے روح رواں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اُن کی شاعری اپنے ماحول کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ اُس میں آبیاری اور راست بازی کی جوت جگاتے رکھیں گی۔

شعیب جاذبؔ قریۂ احساس میں

سید کوثر حسین بخاری

اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایجوکیشن، ضلع لیہ

جاذبؔ کی شاعری جذبات کی افقی سطح کو چھو کر اُس کے ارضی زاویے کو اجاگر کرتی ہے۔ وہ الفاظ اور تشبیہات کا ایک نت نیا بندھن پیش کرتے ہیں۔ جاذبؔ بنیادی طور پر ایک انقلابی شاعر ہے۔ ان کی انقلاب پسندی کا ایک زاویہ طوفانی نوعیت پر منتج ہوتا ہے۔ انھوں نے مظاہر، مناظر اور اشیاءِ فطرت کو ایک انقلابی رنگ سے دیکھا ہے۔

سانسوں کے سلسلوں میں لف اس طرح ہوا
چمٹا ہو جیسے برگ کسی سبز شاخ سے
اسکی رگِ جہات میں کس کس کا خون ہے
پوچھے کوئی شفق کی جبینِ فراخ سے

جاذبؔ کی شاعری میں مسرت کے لمحے کم جب کہ محرومیوں کی افراط ہے۔ وہ زندگی کی پستی سے بلندی کا سفر کرتے ہیں۔

کب غرق ہوئے ریت کے دریا میں سفینے
صحرا کے بگولوں کو نہ گرداب کہا کر
اس دور کا معیار ہے ناچیز نوازی
جاذبؔ یہاں جگنو کو بھی مہتاب کہا کر

جذبے اور نظریے کا یہ شاعر خود پسندی کو کلام میں سمو کر اپنی شخصیت کے اظہار کی شعوری کاوش کرتا ہے جو سادگی اور موسیقیت سے مزین ہوتی ہے۔ یہ بلند آہنگ اور ظلمتِ شب میں سحر کا شاعر حقیقت کو انقلاب سے دیکھتا ہے۔

قریۂ احساس۔ شعری احتجاج

پروفیسر مہر اختر وہاب

شعیب جاذبؔ کا شعری سفر نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ انھوں نے جس ادبی روایت کا گہرا اثر قبول کیا ہے وہ اصغر گونڈویؔ، جگر مرادآبادی اور حسرت موہانی کے زیرِ اثر پروان چڑھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعیب جاذبؔ نے احتجاج و مزاحمت کے لیے بھی غزل گوئی کی اسی روایت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں خطیبانہ رنگ و آہنگ تو ہے مگر وہ انقلابی نعرہ زنی کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے جبر و استحصال کے خلاف احتجاج کو بھی تغزل کے پیراہن میں پیش کیا ہے:

جب بھی کرتا کوئی دیا روشن
وقت سازش ہوا سے کر لیتا

اور لے جاتے ہیں آ کر میری محنت کا ثمر
شہد کی مکھی کی صورت شہد سے محروم ہوں

جو قریۂ شاہی میں رہا مردِ انا کیش
وہ طوق و سلاسل میں گرفتار رہا ہے

شعیب جاذبؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ اُن کے ہاں جدید طرزِ احساس اظہار کلاسیکی فنی روایات کے پیرائے میں ہوا ہے۔ اُن کے ہاں معاصر سیاسی و سماجی تصورات کی پیش کش بھی خالص رومانی لے میں ہوئی ہے۔ اُن کے ہاں طبقاتی شعور، امن کی صدا، معاشی مساوات، سیاسی و سماجی ناہمواری کا بیان اور فنی جمالیات کا اہتمام ایک منفرد رنگِ سخن تخلیق کرتا ہے :

تعمیر کر نہ تاج محل میری راہ میں
آندھی ہوں ایک پل میں کئی گھر سمیٹ لوں

جانے کس سقراط کی آمد ہے صحنِ باغ میں
زہر سے لبریز ہر گل کا پیالہ ہو گیا

لوگ زیرِ عتاب آتے ہیں
پھر کہیں انقلاب آتے ہیں

شعیب جاذبؔ معاشی مسائل اور سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ روحانی تسکین و

ترفع کی بات بھی کرتے ہیں۔اس طرح اُن کی غزل سطحی رومانویت اور سیاسی نظریات کی پیش کش کا وسیلہ نہیں بنی۔وہ اسلام کی روحانی اور دائمی اقدار کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں حسینؑ احتجاج ومزاحمت کا استعارہ ہے اور کربلا جوروجفا کے مقابل صبرووفا کا حوالہ۔اس طرح اُن کی غزل ایک وسیع فکری تناظر میں تخلیق ہوئی ہے:

حالات کے تیروں سے بجھی پیاس اُسی کی
جو کل لبِ ساحل علی اصغر کی طرح تھا

یہ تو گرداب تھا معصوم کا جھولا تو نہ تھا
لہر کیوں سینے پہ کرتی ہوئی ماتم اُٹھی

فاقہ مستی کے صحرا میں
بوذرؓ سے بے زر جاتے ہیں

پھر سے ہوتا ہے ذوالفقار بکف
خیبرِ مکر میں ہیں مرحب لوگ

شعیب جاذبؔ بنیادی طور پر جمال پسند شاعر ہیں۔ وہ محبوب کی تصویر کشی بڑے خوبصورت رنگوں میں کرتے ہیں۔ انھوں نے موسمِ گل کے رنگین پیرہن کے ساتھ خوشبوئے زلفِ یار کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ بہار و خزاں کے ساتھ حسن و عشق اور وصال و ہجر کی داستاں بھی چھیڑتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے بھی موضوعات کو محبت کے آفاقی موضوع میں سمو کر پیش کیا ہے۔ وہ رومان اور حقیقت کے امتزاج سے اپنی انفرادی لے تخلیق کرتے ہیں :

چاند کی کرنوں کی دھن مسحور کن
جیسے شہنائی کسی بارات کی

کتنا جاذبؔ تھا ہری شاخ کا اندازِ خرام
آنکھ ملتی ہوئی دوشیزۂ نیلم اُٹھی

میری پلکوں کا ستارہ تیرے کام آئے کبھی
میں کہاں لے کے ہری شاخ کا پھل جاؤں گا

نازک دلوں سے آئینے چٹخے تراخ سے
تو نے گرائے پھول جو ہونٹوں کی شاخ سے

شاخِ ہستی کا مہکتا پھول ہوں
میں کھلونا تتلیوں کی ذات کا

شعیب جاذبؔ نے زندگی کی اعلیٰ اقدار کا شعوری انتخاب کیا ہے۔ وہ نوع انساں کے اجتماعی دکھ درد کو اپنی شاعری کو موضوع بناتے ہیں۔ اُن کے لہجے میں تندی و تیزی بھی ہے۔ مگر اُن کے ہاں سیاسی وسماجی مسائل جذبہ وتخیل کی زبان میں بیان ہوئے ہیں۔

اپنی محنت کے ثمر سے آج بھی محروم ہوں
کشتِ ہستی میں کسی دہقان کا مقسوم ہوں

میں نہیں تھا بند دروازہ مکانِ عصر کا
مصلحت آمیز چپ کے پڑ گئے تالے مجھے

خاموش لبی جرم ہے ہر عہدِ ستم میں
حق بات پہ اب تقیۂ مریم نہیں ہوگا

بکھر گیا ہو نہ اُن گیسوؤں کا شیرازہ
کہ ہو گیا ہے نظامِ حیات برہم پھر

انھوں نے مختصر اور مترنم بحروں سے بڑا کام لیا ہے۔ وہ عربی و فارسی کے ثقیل اور بوجھل الفاظ و تراکیب کی بھرمار نہیں کرتے۔ اُن کی غزلیں لطیف لفظیات کے ساتھ سادگی و روانی سے پر تاثیر بنی ہیں۔ وہ کہیں بھی قنوطیت پسندی کا شکار نہیں ہوتے۔ اُن کی شاعری رجائیت بخشتی ہے اور زندہ رہنے کا حوصلہ کرتی ہے:

چھالوں نے ہٹائے ہیں میری راہ کے پتھر
اک عمر سے رستہ میرا ہموار رہا ہے

اک ایسا دور بھی جاذبؔ میری نظر میں ہے
نہ تاج دے گا صدائیں نہ تخت بولیں گے

قابیل کو ہم قتل کی مہلت نہیں دیں گے
ہابیل پہ اب نوحۂ آدم نہیں ہوگا

قریۂ احساس کی فنی جہتیں

عقیل احمد شید۔آر۔بی، قریشی ہاشمی۔لیہ

ہماری قوتِ متخلیہ انگشت بدنداں ہے کہ ہم اپنے لبوں پر قلم رکھے سوچ رہے ہیں کہ شعیب جاذبؔ کے غزلیہ کلام اور سدابہار تخلیق ''قریۂ احساس'' کے بارے میں کن آرا کا اظہار کریں، حوالے کے طور پر کون کون ساشعر پیش کریں اور زیرِ تبصرہ لائیں۔ تمام اشعار میں خیالات کی آبشار بہہ رہی ہے لفظوں، معانی اور مطالب کی پھوار برس رہی ہے۔

تشبیہات کے چمن زار میں بہار ہی بہار ہے۔اصطلاحات وتلمیحات کے گلہائے گوناں گوں پر نکھار ہی نکھار ہے جس پہ دل وجان نثار ہے۔۔کسی غزل کے کسی شعر کونظر انداز کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ ہر شعر دل کی گہرائیوں میں براہِ راست اترتا جاتا ہے۔اُردو شاعری کے دو دبستان ہیں: دہلی اور لکھنو، شعیب جاذبؔ سرائیکی وسیب کا بذاتِ خود ایک اپنی طرز کا دبستانِ شاعری ہے۔ایک ہی قافیہ ردیف میں (32,23,18,15) طویل غزلیں کہنا زود گوئی پر منتج ہے۔

ملازم حسین جاذبؔ جس کے والدین کی مادری زبان سرائیکی ہے، سرائیکی ماحول میں اچھے اچھے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔فنی لحاظ سے موصوف بلند مقام پر فائز ہیں۔

مضمون آفرینی اور تخیلات کا کمال یہ ہے کہ اپنے، افکار وخیالات کو دہراتا نہیں ہر شعر، ہر غزل، ہر نئے مجموعہ کلام میں وہ فن کی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔

گو جسمانی طور پر وہ پیرانہ سالی میں دکھائی دیتا ہے لیکن شاعری ان کی پورے شباب پر ہے۔

''قریۂ احساس'' میں روایتی غزل سے زیادہ حقائق، جبر و تشدد کے خلاف آواز، فطرت کا مشاہدہ اور زندگی کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اُن کے ہاں یار کے لب و رخسار، زلفِ سیاہ دراز کی حکایات کم اور ادب برائے حیات اور مقصدِ حیات کا پیغام زیادہ ہے۔

صنعتِ تلمیح

ایسا کلام ہے جس میں کسی مشہور واقعہ یا ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا جائے کہ کتب مستعملہ میں جس کا ذکر ہو۔

قابیل کو ہم قتل کی مہلت نہیں دیں گے
ہابیل پہ اب نوحۂ آدم نہیں ہوگا

اس میں صنعتِ تلمیح ہے۔ بلحاظ بحر یہ شعر ہزج مثمن اخرب مکفوف مخدوف ارکان بحر (مفعولُ مفاعیل مفاعیل فعولن):

یہ نہ ہاروت ہیں نہ ہیں ماروت
چاہِ بابل میں کس لیے اب لوگ

اس شعر میں صنعتِ تلمیح ہے اور اس شعر میں اس مشہور واقعہ کا ذکر ہے، کسی قدر اس شعر میں صنعت مراعاۃ النظیر بھی ہے۔ کئی چیزوں کو کلام میں درج کرنا اور ان میں باہم مناسبت ہو۔ ہاروت و ماروت کو چاہِ بابل سے نسبت ہے۔

اصل ارکان بحر: (فاعلاتن مفاعلن فعلن) پہلا اور دوسرا مصرع (فاعلاتن مفاعلن مفعول) بحر خفیف مسدس مجنون مخدوف مقطوع۔

میں کیسے طور پر دیکھوں گا جلوہ

سنا ہے لن ترانی ہو گئی ہے

یہ واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ حضرت موسےٰ نے کوہ طور پر جلوہ ربانی کا تقاضہ ربِ ارنی کہہ کر کیا تھا۔ جواب میں رب العزت نے کہا تھا: لن ترانی۔ اس مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے، واقعہ میدان طویٰ میں ہوا۔ (کوہ طورِ سینا)

بحرِ ہزج مسدس محذوف ارکان (مفاعی لن + مفاعی لن + فعولن)

میں فکرِ براہیم ہوں آذر تو نہیں ہوں

میری تو ہمہ وقت ہر اک بت سے ٹھنی ہے

اس شعر میں فکرِ براھیم آذر اور بت کی طرف اشارہ سے صنعت تلمیح معرضِ وجود میں آ گئی۔ ٹھنی ہے محاورہ نے شعر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ عروضی لحاظ سے یہ شعر بحرِ ہزج مثمن اخرب مکفوف میں ہے۔

ارکان بحر: مفعول مفاعیلن مفاعیلن فعولن یعنی مفعول مفاعی لن مفاعی لن فعولن۔

خاموش لبی جرم ہے اس عہدِ ستم میں

حق بات پہ اب تقیہ مریم نہیں ہوگا

مریم کے لغوی معنی ہیں: پارسا و پرہیزگار عورت۔ اس شعر میں بھی صنعت تلمیح، جرم قرار دینا اور عہدِ ستم کی خاصیت قرار دینے سے اور بھی حسن دو چند بڑھ گیا ہے

قارئین کرام یہ تو ''قریۂ احساس'' سے چند تلمیحات قرآن مجید کی روشنی میں ، ہم نے آپ کو ضو فشاں کرتے ہوئے پیش کی ہیں۔ چند امثال تاریخِ نجد کے صحراؤں، تاریخِ یونان کے درباروں اور ساتھ ہی شیریں فرہاد کی تاریخی حقیقت موجود ہے۔

ملاحظہ کریں لیکن پہلے اسلامی تاریخ ۔

پھر سے ہوتا ہے ذوالفقار بکف
خیبرِ فکر میں ہیں مرحب لوگ

ذوالفقار بکف، مرحب، خیبر ایسے الفاظ پڑھتے ہیں تو ذہن غزوہ خیبر کی طرف مبذول ہوجاتا ہے۔ذوالفقار حضرت علی حیدرِ کرار کی دودھاری تلوار کا نام ہے ۔ مرحب کے لغوی معانی: فراخ ہونا، وسیع جگہ، یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ اس کافر پہلوان کا نام ہے جس کا مقابلہ حضرت علی حیدر کرار سے ہوا، نہایت بہادر، جنگجو، دراز قدوقامت کا تھا۔ حیدرِ کرار کے ہاتھوں مارا گیا غزوہ خیبر میں ۔شعر میں نیا ولولہ، نیا حوصلہ اور نیا عزم ہے۔ مکار لوگوں کو مرحب کہا گیا اور خیبر مکر و فکر کے لفظ نے شعر میں فصاحت و بلاغت کا حسن اور بھی ابھار دیا ہے۔

صنعت تلمیح ، صنعت مراۃ النظیر :

عروضی لحاظ سے بحرِ خفیف مسدس مجنون محذوف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)

بحرِ خفیف مسدس مجنون محذوف (مقطوع فاعلاتن مفاعلن فعلن)

(پھر سے ہوتا ہے ذوالفقار بکف)

ارکانِ بحر: (فاعلاتن مفاعلان فعل)

(اور خیبر فکر میں ہیں مرحب لوگ) (فاعلاتن مفاعلن مفعول)

دونوں بحور کا ایک شعر میں اجتماع جائز ہے۔

حالات کے تیروں سے بجھی پیاس اسی کی
جو کل لبِ ساحل علی اصغر کی طرح تھا

شعر پڑھتے ہی توجہ واقعہ کربلا پر مرکوز ہو جاتی ہے۔لب ساحل، پیاس، تیروں، علی اصغر سے تشبیہ لیکن حالات کے تیروں سے پیاس کا بجھانا لب ساحل پر علی اصغر کی طرح کھڑا کر دینے سے اور بھی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔علی اصغر کی شہادت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے لیکن جاذبؔ نے زندگی کا اسے اصول بنا کر پیش کیا ہے جس نے علی اصغر کی طرح صراطِ مستقیم کو اپنایا حالات کے تیروں سے اس کا یہی حال ہوا۔
عروضی طور پر شعر بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں ہے۔
ارکان بحر : (مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن) ہے۔

تاریخِ یونان :

جانے کس سقراط کی آمد ہے صحنِ باغ میں
زہر سے لبریز ہر گل کا پیالہ ہو گیا

سقراط ایک بہت بڑے یونانی حکیم کا نام ہے۔وہ بت پرستی و توہمات کے خلاف تھا اس لیے یونان کی عدالت نے اس کی موت کا حکم دیا اور وہ زہر پلا کر ستر برس کی عمر میں ہلاکت کر دیا گیا۔

سقراط، صحنِ باغ میں زہر اور گل کا پیالہ، موسمِ بہار کی آمد کا اس انداز میں سوالیہ لہجہ میں ذکر کرنا، پھولوں کے کھلنے کو کٹوروں کی صورت اختیار کرنا، لبریز زہر سے ہونا، پھولوں کو پیالوں سے تشبیہ، تلمیح، گل کی نسبت صحن باغ کے لفظ استعمال کرنا، کمال کا حسن پیدا کر دیا گیا ہے۔

جانے کس سقراط کی آمد ہے صحنِ باغ میں
زہر سے لبریز ہر گل کا پیالہ ہو گیا

بحرِ رمل مثمن محذوف میں ہے۔ ارکانِ بحر (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن)

تاریخی مطالعہ۔

میری آنکھوں سے جوئے شیر نہ ٹپکی جاذبؔ
حادثے پڑتے رہے تیشۂ کوہکن کی طرح

محفل میں لٹا بیٹھا ہے اشکوں کا خزانہ
جاذبؔ بھی تو حاتم کی طرح دل کا غنی ہے

جوئے شیر تیشۂ کوہکن سے ایران کی رومانوی تاریخ کے وہ اوراق کھلنے لگتے ہیں جن میں شیریں فرہاد کی داستانِ عشق رقم ہے۔ جوئے شیر لانا محاورہ ہے دودھ کی نہر نکال کرلانا نہایت ہی مشکل کام سرانجام دینا۔ کہتے ہیں فرہاد سے شرط رکھی گئی تھی کہ وہ "بیستون" کاٹ کر شیریں کے محل تک دودھ کی نہر نکال کرلائے تو اس کا عشق کامل سمجھتے ہوئے اسے شیریں دے دی جائے گی۔ کہتے ہیں فرہاد جوئے شیر لانے میں کامیاب ہوا دوسری جانب سے بدعہدی ہوئی دھوکہ ہوا فرہاد سر پر تیشہ مار کر مرگیا۔ اسی غزل کے دو شعر ملاحظہ کریں۔

کان میں گھولتا ہے رس تیرا اندازِ خرام
تری آہٹ بھی ہے پازیب کی چھن چھن کی طرح

اپنے جوڑے میں ستاروں کا جڑاؤ کر کے
آج شرمانے لگی جھیل بھی دلہن کی طرح

عروضی لحاظ سے یہ غزل بحرِ رمل مثمن مخبون محذوف

ارکان بحر: (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن)،

بحر رمل مثمن مخبون مکسور ارکان بحر : (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات، فعلان)

اور بحر رمل مثمن مخدوف مقطوع:

ارکان بحر: (فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن)

ایک ہی غزل میں ان بحور کا اجتماع جائز ہے اُردو، فارسی اور عربی ادب میں بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔

قریۂ احساس میں ہمیں ایک خوبی اور محسوس ہوئی وہ ہے غزلیہ کلام ہونے کے باوجود خمریات سے پاک ہے اُردو، فارسی اور عربی ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ وہ پہلا مجموعۂ کلام ہے جو غزلیہ ہونے کے باوجود خمریات سے پاک و مبرا ہے یعنی کہیں ساقی شراب اور مئے کشی کا ذکر تک نہیں ہے۔

جبر و تشدد کے خلاف آواز اور عزم

صبح کے حق میں بھی آواز بہت کم اُٹھی
کتنی تحریک اندھیروں کی منظّم اُٹھی

سولی پہ لٹکنے کا کبھی غم نہیں ہوگا
حالات کی دہلیز پہ سر خم نہیں ہوگا
آوازِ فغاں آئے گی قاتل کے گھروں سے
اب اپنی جواں مرگ کا ماتم نہیں ہوگا

کرتے ہیں پسند ہم تو سرِ دار بھی آنا
حق بات کا اظہار کبھی کم نہیں ہوگا

پرانی ثقافت :

عہدِ قدیم میں اکثر شادی بیاہوں اور خوشی کی محافل میں شادیانے اور شہنائی بجا کرتی تھی

لبِ شہنائی پہ ہیں نغمانے
کہیں تقریبِ حنا بھی ہوگی

حقائق

لوگ زیرِ عتاب آتے ہیں
پھر کہیں انقلاب آتے ہیں

جاذبؔ تجھے کس طرح لگی جونک غموں کی
اے دوست بدن ترا تو پتھر کی طرح تھا

مشاہدہ فطرت :

چوٹ چمقاق نے کھائی جونہی
آگ پتھر کے بدن سے نکلی

گل جبینوں کی قبر پر جاذبؔ
مسکراتے گلاب آتے ہیں

اتنا رویا ہوں کہ اب آنکھ میں آنسو ہی نہیں
ابر جب کھل کے برستا ہے تو چھٹ جاتا ہے

پیار کی دھوپ کے مانوس سفر میں اکثر
میرا سایہ مرے قدموں سے لپٹ جاتا ہے

صرف اُلٹی ہوئی قسمت کا یہ معمول نہیں
سانپ جس وقت بھی ڈستا ہے الٹ جاتا ہے

ڈھیر ہو جاتے ہیں بستی کے گھروندے جس وقت
زور بڑھتے ہوئے سیلاب کا گھٹ جاتا ہے

نہایت ہی پیارے اشعار ہیں ہمارے قلم کی تشنہ لبی ابھی نہ گئی اگر شعیب جاذب کی تخلیق ''قریۂ احساس'' پر کئی سو صفحات کا تبصرہ ہی تحریر کر دیں تو پھر بھی ہم سے حقِ تنقید و تبصرہ ادا نہ ہوگا۔

حوالہ جات

قرآن پاک :

1- سورۂ مریم
2- سورۂ مائدہ
3- سورۂ النساء
4- سورۂ آلِ عمران
5- سورۂ المومنون
6- تفسیر ابنِ کثیر جلد اول، ص۔ 149
7- تفسیر ابنِ کثیر جلد دوم، ص۔ 57
8- تفسیر ابنِ کثیر، جلد سوم، ص۔ 83
9- اسلامی انسائیکلو پیڈیا، ص۔ 1352
10- فروز اللغات، ص۔ 83,192

قریۂ احساس ــــــ کربِ احساس کی داستان

پروفیسر مزمل حسین

شاعری اظہارِ ذات کا موثر ترین ذریعہ ہے اور غزل اس ذریعۂ اظہار میں ایک خصوصی اہمیت کی حامل قرار پائی ہے۔ نئی غزل کے بارے میں شاید یہ تذکرہ ضروری نہ ہو کہ عہد بہ عہد تبدیلیوں کے ساتھ اس صنفِ سخن نے بھی عصری مسائل کو اپنے اندر سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یوں ہماری نئی غزل ہم عصر ادبی تحریکوں سے اپنے فکری و معنوی کینوس کو وسیع سے وسیع تر کر رہی ہے۔ شعیب جاذب جن کا شمار ادب اور غزل کے اساتذہ میں ہونے لگا ہے ان کی غزل بھی اسی لیے وسعت اور موضوعاتی گہرائی سے عبارت ہے۔

''قریۂ احساس'' ایک ایسا مجموعہ کلام ہے جو جدید غزل کے باب میں معتبر حوالے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں شاعر نے طمانیت، فنی مہارت، جذبے کی سرشاری اور لہجے کی تازگی سے فکر و خیال کی ایک خوب صورت فضا قائم کی ہے۔ اس شاعری میں اپنے عہد کا جلا بھی ہے اور عظیم تر محبتوں کا جمال بھی جلوہ گر ہے۔

چہرے پہ سجائیں گے نہ اب دیدۂ یعقوب\
یوسف کے لیے گریۂ پیہم نہیں ہوگا

کرتے ہیں پسند ہم تو سرِ دار بھی آنا\
حق بات کا اظہار کبھی کم نہیں ہوگا

شعیب جاذب کی شاعری کا بنیادی محرک ان کی فنکارانہ ''حیرت'' ہے۔
جس کے جلو میں وہ آتی جاتی رتوں کو بڑی معصومیت سے دیکھ کر پہلے مسرت کا شکار ہوتا ہے اور پھر جذبے اور خیال کی مدد سے اسے گہری بصیرت سے ہم کنار کرتا ہے بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ شاعر اپنے گرد و پیش میں گم ہو کر سراغِ ذات کی منزلوں کو طے کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تلاشِ ذات کے اس سفر میں وہ تنہا نہیں بلکہ وہ انسانوں کے ایک ہجوم کے ساتھ زیست کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

میں آہٹ سن رہا ہوں چاندنی کی
فلک کی مہربانی ہو گئی ہے

نہیں کرتی وہ بستے کا تقاضا
مری بچی سیانی ہو گئی ہے

اس کے ہاں دھرتی اور اس پر سانس لینے والے انسان ایک مربوط اور منظم دکھ میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں لیکن شاعر اس سماجی جبر سے نجات پانے کے لیے کسی ماورائی طاقت پر انحصار نہیں کرتا بلکہ وہ تمام دکھی انسانوں کو ایک طبقاتی اکائی کی صورت میں جد و جہد کی ترغیب دیتا ہے۔

؎ قابیل کو ہم قتل کی مہلت نہیں دیں گے
ہابیل پہ اب نوحۂ آدم نہیں ہوگا

ممکن ہے کشتِ گرد سے ہریالیاں اُگیں
بنجر زمیں پہ بارشیں ہونے دیا کرو

راکھ کے ڈھیر کو جونہی چھیڑا
شعلگی راکھ کے تن سے نکلی!

یوں شعیب جاذبؔ کی شاعری کی پہلی پرت جو حیرت سے ظہور پاتی ہے، گہری فلسفیاتی سطح پر منتج ہوتی ہے۔ اور ایک بڑی شاعری کی یہی خاصیت ہے کہ اس میں سادگی اظہار اور خلوصِ فن کے عناصر نمایاں ہوں۔ آسان راستے سے، پیچیدہ اور سنگلاخ گھاٹیوں کا سفر بھی طے ہو جائے اور قاری کو اس کا احساس تک نہ ہو، قریۂ احساس اسی فکری سفر کا آئینہ دار ہے۔

جس کے لہجے میں انا بھی ہوگی
اس پہ اک روز جفا بھی ہوگی

شعیب جاذبؔ کا زیرِ نظر مجموعہ کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر محض تسکینِ ذات کے لیے غزل نہیں کہتا بلکہ وہ تو ایک مثالی معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں سرگرداں وکوشاں دکھائی دیتا ہے۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے غزل کی نئی معنویت کے درا ہوں گے اور اس کے حوالے سے جدید اُردو غزل میں نئے فنی اضافے بھی ہوں گے۔ مثلاً شعیب جاذبؔ کے مندرجہ ذیل اشعار ان کے تخلیقی امکانات کی خبر دیتے ہیں۔

میں بری از گناہ بھی ہوتا
کوئی جھوٹا گواہ بھی ہوتا

جس کے لہجے میں انا بھی ہوگی
اس پہ اک روز جفا بھی ہوگی

کیونکر نہ ہمہ وقت کروں اس کی تمنا
احساس کی دیوی مرے ہاتھوں میں جنی ہے

اُٹھے تو کرے دھوپ میں میلوں کی مسافت
بیٹھے تو مسافر کے لیے چھاؤں گھنی ہے

بارانی زمینوں میں بارش جیسا ایک شخص

منور بلوچ

صبح کے حق میں بھی آواز بہت کم اُٹھی
کتنی تحریک اندھیروں کی منظم اُٹھی

بارانی زمینوں میں بارش جیسا اندھیروں میں اجالوں جیسا اک شخص شعیب جاذب محبت تو کسی عہد میں بھی کم نہیں تھی اور محبت تو اس عہد میں بھی عام نہیں لیکن شعیب جاذب محبت کی کھیتیاں کاشت کرنا چاہتا ہے۔لوگوں کو محفوظ کرنے کی راہیں دکھاتا ہے۔

محفوظ ہو سکیں گی نہ شیشوں کی کونپلیں
پتھر کے بیج گھر میں نہ بونے دیا کرو

شعیب جاذب جدید غزل میں ماضی، حال اور مستقبل کے سارے خواب یک جا کرتا ہے۔ حال کے انسان کو زندہ رہنے کا حوصلہ مہیا کرتا ہے اگر چہ ظلم اور زیادتی اپنے عروج پر ہے۔

شعیب جاذب انسانی رویوں، آہوں، اشکوں اور خوشیوں کو اکٹھا کر کے کاغذ پر اتارنے کا فن جانتا ہے۔احساس کو شاعری بنانا اس کے لیے عام سی بات ہے۔

کیسے عدم آباد کی سرحد کو پھلانگوں
رستے میں مرے جسم کی دیوار تنی ہے

اُٹھے تو کرے دھوپ میں میلوں کی مسافت
بیٹھے تو مسافر کے لیے چھاؤں گھنی ہے

شعیب جاذبؔ کا شعری سفر کئی دھائیوں پر محیط ہے۔ حالات کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں ۔ شعیب جاذبؔ کا کمال ہے کہ جہاں صاحبِ ثروت لوگ کتاب خریدنے پر 100 روپے خرچ نہیں کرتے وہاں شعیب جاذبؔ کتاب لکھنے پر ہزاروں روپے لگا دیتا ہے۔

یہ فقیر صفت درویش شخص اس عہد میں لفظ لفظ پگھل رہا ہے۔ موم کی قطروں کی طرح حال اور مستقبل کے انسان کو بچانے کا درد لیے توانائیوں سے زندہ ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ اس کی توانائیوں کو سلامت رکھے۔

بارانی زمینوں میں بارش جیسا شخص شعیب جاذبؔ۔

قرطاسِ تشکر

میں ان تمام کرم فرماؤں کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں جن کی قلمی شعاعوں سے میری تصنیف ''قریۂ احساس'' کو چار چاند لگے، جن میں: ڈاکٹر خیال امروہوی، ڈاکٹر صاحبزادہ سلطان الطاف علی، محمد جمیل اختر قریشی ڈی۔او۔کالج لیہ، پروفیسر مزمل حسین، جناب منور بلوچ، جناب عقیل شید۔آر۔بی۔محترمہ شاہین زیدی، محترم سید شفقت حسین سبزواری، جناب اقبال مجیدی اورڈاکٹر اقتدار ضیغم بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔

شمشاد حسین سرائی، خادم حسین سرائی اور سلیم اختر ندیم کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے پروف ریڈنگ میں میری مدد فرمائی۔یونس خان بزدار بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے عرق ریزی سے کتاب ہٰذا کی کمپوزنگ کی۔ڈائریکٹر اظہار سنز۔لاہور، ایس۔ایم۔علی معظم رضوی نے میری کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا ہے میں تہہ دل سے اُن کا شکر گزار ہوں۔

میں گرامی مرتبت سید کوثر حسین بخاری (اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایجوکیشن ضلع لیہ) اور پروفیسر مہر اختر وہاب کا رہینِ احسان ہوں جن کے بھرپور تعاون کے بغیر کتاب کی اشاعت ناممکن تھی۔

شعیب جاذب

O

صبح کے حق میں بھی آواز بہت کم اُٹھی
کتنی تحریک اندھیروں کی منظّم اُٹھی

یہ تو گرداب تھا ، معصوم کا جھولا تو نہ تھا
لہر کیوں سینے پہ کرتی ہوئی ماتم اُٹھی

چاندنی ایسے گھٹاؤں سے نمودار ہوئی
شب کی محراب سے جیسے کوئی مریم اُٹھی

یاد کی شال تو اک عمر ہوئی چاک ہوئے
آنکھ کس خواب کا بُنتے ہوئے ریشم اُٹھی

زندگی سانس کی چھاؤں میں جو ستانے لگی
ایک دیوار بدن کی قدِ آدم اُٹھی

لب تک آتے ہوئے کس کرب سے دم توڑ گئی
گونج احساس کے گنبد سے جو پیہم اُٹھی

ریت کو پھانکنے والوں نے مزے لوٹ لیے
زر کی آندھی مرے صحراؤں میں یک دم اُٹھی

کتنا جاذبؔ تھا ہری شاخ کا اندازِ خرام
آنکھ ملتے ہوئے دوشیزۂ نیلم اُٹھی

OOO

O

سولی پہ لٹکنے کا کبھی غم نہیں ہوگا
حالات کی دہلیز پہ سر خم نہیں ہوگا

آوازِ فغاں آئے گی قاتل کے گھروں سے
اب اپنی جواں مرگ کا ماتم نہیں ہوگا

ہم کھر کے چہرے اتاریں گے نقابیں
احساس کا سورج کبھی مدھم نہیں ہوگا

خونخوار کے ہر قصر پہ لہرائیں گے پرچم
ہر وقت نگوں ہوش کا پرچم نہیں ہوگا

خاموش لبی جرم ہے اس عہدِ ستم میں
حق بات پہ اب تقیۂ مریم نہیں ہوگا

چہرے پہ سجائیں گے نہ اب دیدۂ یعقوب
یوسف کے لیے گریۂ پیہم نہیں ہوگا

قابیل کو ہم قتل کی مہلت نہیں دیں گے
ہابیل پہ اب نوحۂ آدم نہیں ہوگا

کرتے ہیں پسند ہم تو سرِ دار بھی آنا
حق بات کا اظہار کبھی کم نہیں ہوگا

صحرا میں اگر ٹوٹ کے برسا بھی کسی وقت
وہ ابرِ مرے زخم کا مرہم نہیں ہوگا

جاذبؔ جو مرا قافلۂ کرب و بلا ہے
بڑھتا ہوا یہ قافلہ اب کم نہیں ہوگا

OOO

O

اک سانس کہ دروازۂ لب کھول کے چپ ہے
یہ کیسا پرندہ ہے جو پر تول کے چپ ہے

دم توڑتے سورج کی ہیں اکھڑی ہوئی سانسیں
جو ہانپتی کرنوں کی صدا گھول کے چپ ہے

اک تو کہ جسے جھوٹ پہ اصرار مسلسل
اس شخص کو بھی دیکھ جو سچ بول کے چپ ہے

دراصل وہ مایوس ملا کربِ جہاں سے
جو آنکھ کی سیپی میں گہر رول کے چپ ہے

کیا سوچ کے منہ بولتی قسمت کا ستارا
ہاتھوں کی لکیروں میں مجھے تول کے چپ ہے

شاہد مرے اندر کا سلگتا ہوا دکھ ہو
نس نس میں جو اک کرب نیا گھول کے چپ ہے

اظہار کی رُت میں ہے گھٹن اور زیادہ
کیوں سوچ کے پردے میں قلم بول کے چپ ہے

اک عمر ہوئی ڈوبتی آنکھوں کا ستارا
قیدی کی طرح حبس میں پٹ کھول کے چپ ہے

اس بپھرے ہوئے مہر پہ حیران ہوں جاذبؔ
جو چبھتی شعاؤں کی زباں کھول کے چپ ہے

OOO

O

زبان زہر کی تلخی سے کھول بھی نہ سکوں
لبوں پہ سانپ بٹھا دو کہ بول بھی نہ سکوں

بھٹک گیا ہوں حوادث کے کس جزیرے میں
جہاں میں اُمڈے ہوئے اشک رول بھی نہ سکوں

رخِ حیات پہ پھیلی ہیں سلوٹیں کتنی
وہ تیرگی ہے کہ خود کو ٹٹول بھی نہ سکوں

وہی ہیں آج مری آستین کی رونق
میں اپنا رازِ دروں جن پہ کھول بھی نہ سکوں

وہ خوشبوؤں کی طرح رچ گیا ہے سانسوں میں
میں جس کی ذات کو پلڑے میں تول بھی نہ سکوں

قلم پہ کونسی افتاد پڑ گئی اب کے
بیاضِ فکر میں الفاظ رول بھی نہ سکوں

وہ بادبان کی صورت اُٹھائے پھرتا ہے
میں بحرِ تند کی نبضیں ٹٹول بھی نہ سکوں

نہ جانے کون سی ہے مصلحت عدالت میں
جو بند لب ہیں مرے ان کو کھول بھی نہ سکوں

میں پھر کہاں کا قلمکارِ وقت ہوں جاذبؔ
پگھلتی چاندنی ساغر میں گھول بھی نہ سکوں

OOO

O

کرب کی ایک چبھن سے نکلی
سانس کی پھانس بدن سے نکلی

رات کا پھول مہک اُٹھا ہے
بوئے مہتاب کرن سے نکلی

کتنی برفیلی چٹانیں پگھلیں
دھوپ جو مہرِ کہن سے نکلی

مل رہی ہے کفِ افسوس صبا
پھول کی لاش چمن سے نکلی

چوٹ چقماق نے کھائی جونہی
آگ پتھر کے بدن سے نکلی

لاش اُٹھی مری خاموشی سے
چپ کی فریاد کفن سے نکلی

جب بھی اُلٹے ہیں ورق ہستی کے
راہِ مضمون متن سے نکلی

راکھ کے ڈھیر کو جونہی چھیڑا
شعلگی راکھ کے تن سے نکلی

پاؤں سوزن سے کریدا اس نے
خار کی نوک جتن سے نکلی

لوٹ کے آئی نہ واپس جاذبؔ
بات کوئی جو دہن سے نکلی

OOO

O

دشتِ ہستی میں نہ کوئی راہزن آلے مجھے
دو قدم چلنے نہیں دیتے مرے چھالے مجھے

میں نہیں تھا بند دروازہ مکانِ عصر کا
مصلحت آمیز چپ کے پڑ گئے تالے مجھے

زندگی یوں تو کہاں کرتی ہے میری پرورش
آستیں کا سانپ بن جاؤں تو پھر پالے مجھے

رازِ سر بستہ ہوں میں بھی سینۂ حالات میں
اک خزانہ ہوں کوئی آکر نہ ہتھیالے مجھے

بڑھ رہا ہے میری جانب بحر کا بھوکا بھنور
تر نوالہ جان کر ساحل نہ خود کھالے مجھے

وہ گہر ہوں موج کی سلوٹ میں گم رہتا ہوں میں
اک سمندر چھان لے تو پھر کہیں پا لے مجھے

تشنۂ صحرا کی طرح تکتا رہا اس کی طرف
اک گرجتے ابر کی صورت نہ وہ ٹالے مجھے

میں نے جب دیکھا کوئی تنکا ہوا میں اڑ گیا
دشتِ جاں میں پڑ گئے ہیں جان کے لالے مجھے

لوٹنا سیکھا نہیں ہوں وقتِ رفتہ کی طرح
میں کوئی تاریخ ہوں جو آ کے دہرا لے مجھے

رات بیچاری تو جاذبؔ مفت میں بدنام ہے
روشنی میں بھی کئی چہرے ملے کالے مجھے

OOO

O

مقاتل میں گرانی ہو گئی ہے
کہانی اب پرانی ہو گئی ہے

لبِ احساس ہے افسردہ خاطر
ستم کی حکمرانی ہو گئی ہے

تقاضا ہے سحر سے روشنی کا
ذرا سی بدگمانی ہو گئی ہے

مری سانسیں رہیں جس سے معطر
وہ خوشبو آنجہانی ہو گئی ہے

فصیلوں پر دیا جلتا بھی کیسے
ہوا سے چھیڑ خوانی ہو گئی ہے

میں آہٹ سن رہا ہوں چاندنی کی
فلک کی مہربانی ہو گئی ہے
ہُوا گل نکہتِ گل کا تبسم
خزاں کی حکمرانی ہو گئی ہے
میں کیسے بام پر دیکھوں گا جلوہ
سنا ہے لن ترانی ہو گئی ہے
وہ آئینے کے دریا میں نہایا
جوانی پانی پانی ہو گئی ہے
نہیں کرتی وہ بستے کا تقاضا
مری بچی سیانی ہوگئی ہے
میں جس منزل پہ جاذبؔ چل پڑا ہوں
وہ منزل جاودانی ہو گئی ہے

OOO

O

جگمگاتی سیمگوں لہریں جو طغیانی پہ ہیں
در حقیقت بحر کی کچھ پسلیاں پانی پہ ہیں

دن کے ماتھے پر پسینہ دیکھ کر ایسے لگا
جیسے شرمندہ شعاعیں اپنی عریانی پہ ہیں

میں نے لکھا ہی نہیں جب زندگی کا سرورق
انگلیاں کیوں کار بند اوراق گردانی پہ ہیں

میرا دریا میں اترنے کا ارادہ ہی نہیں
سلوٹیں پھر کس لیے دریا کی پیشانی پہ ہیں

رات بھر جلنا پڑا ان کو پرائی آگ میں
اس لیے تو دیپ برہم شب کی من مانی پہ ہیں

جھلملاتی روشنی کے شہر میں ایسے لگا
جیسے کچھ آوارہ سایے میری نگرانی پہ ہیں

جو مری لوحِ جبیں پر خندہ زن تھیں آج تک
اب وہ تحریریں مری تربت کی پیشانی پہ ہیں

گرچہ گورے جسم پر ہیں بادلوں کی چادریں
پھر بھی شرمندہ شعاعیں اپنی عریانی پہ ہیں

کیا لکھا ہے مصحفِ گل پر خزاں کا فیصلہ
شاخچوں کی انگلیاں اوراق گردانی پہ ہیں

غم زدہ چہرے پہ جاذبؔ اشک ریزے یوں لگے
جیسے کچھ یخ بستہ گالے کوہِ برفانی پہ ہیں

ooo

O

لمحوں کو نرم نرم کھلونے دیا کرو
صدیوں کی ہے تھکن انہیں سونے دیا کرو

اتری نہیں افق سے اگر میل ابر کی
قوس قزح کے رنگ سے دھونے دیا کرو

ہوگا غمِ خزاں کا ازالہ اسی طرح
شبنم کو چیخ چیخ کے رونے دیا کرو

ممکن ہے کشتِ گرد سے ہریالیاں اگیں
بنجر زمیں پہ بارشیں ہونے دیا کرو

معصوم آرزو کو بہلنے کے واسطے
سوچوں کے رنگا رنگ کھلونے دیا کرو

پلکوں پہ جھول جھول کے لمحے تو تھک گئے
کچھ دیر کے لیے انہیں سونے دیا کرو

محفوظ ہو سکیں گی نہ شیشوں کی کونپلیں
پتھر کے بیج گھر میں نہ بونے دیا کرو

کوئی پرند شاخِ شجر سے نہ بچ سکے
اب ترکشوں کو تیر تکونے دیا کرو

جاذبؔ غزل کی ریشمی گل رنگ شال میں
جذبوں کی پتیاں بھی پرونے دیا کرو

OOO

O

چند سکوں کے ترازو میں نہ تولا جائے
ہم سے یوں نرخ کے لہجے میں نہ بولا جائے

کسی مرہم کا تدارک تو بڑی بات نہیں
پہلے احساس کے زخموں کو ٹٹولا جائے

کتنے شاہوں کے خزانے ہیں بیاضِ دل میں
بند گھڑی کو کسی روز تو کھولا جائے

کسی سقراط کی آمد ہے چمن زاروں میں
کاسۂ گل میں کوئی زہر ہی گھولا جائے

ٹوٹتے دل کی صدا شہر جفا میں گونجی
جس طرح کانچ محل پہ کوئی اولا جائے

دھڑکنیں وقت کی پھر تیز ہوئی جاتی ہیں
نبضِ گیتی کو بڑی دیر ٹٹولا جائے

قریۂ چشم سے اب اشکِ رواں ہیں ایسے
جیسے بارات میں دیہات کا ٹولا جائے

چلچلاہٹ سے ذرا سا تو سکوں پا جاؤں
پھوٹنے کو کہاں زخموں کا پھپھولا جائے

ہم کو ہے اپنی ہی دھرتی سے محبت جاذبؔ
کیوں ہمیں قریۂ مہتاب میں رولا جائے

ooo

O

میں بری از گناہ بھی ہوتا
کوئی جھوٹا گواہ بھی ہوتا

تھیں چٹانیں اگر سمندر میں
کوئی عرشہ تباہ بھی ہوتا

خوشبوئیں در بدر بھٹکتی ہیں
ان کا قصرِ پناہ بھی ہوتا

اپنی ہی ذات سے جو ٹکراتے
حادثہ جانکاہ بھی ہوتا

چاند کے دودھیا اجالوں سے
ظلمتوں کا نباہ بھی ہوتا

کشتیِ عزم آتی ساحل تک
گو بھنور سدِ راہ بھی ہوتا

آسماں کے بسیط حلقے میں
نوحۂ کربِ ماہ بھی ہوتا

تختِ گل میں گلاب کے سر پر
کجکلاہی کلاہ بھی ہوتا

پڑھ رہا تھا کتاب گیتی کی
کچھ تو پیشِ نگاہ بھی ہوتا

لقمۂ فقر پر بسر ہوتی
میں اگر بادشاہ بھی ہوتا

سرد لمحوں کی راکھ میں جاذبؔ
شعلۂ سرد آہ بھی ہوتا

OOO

O

یہ الگ بات آبدیدہ ہوں
مثلِ گل برگِ برگزیدہ ہوں

تازیانے شعاعوں کے جس پر
وہی دشتِ ستم رسیدہ ہوں

جو سماعت میں آ نہیں سکتا
اک وہی حرفِ ناشنیدہ ہوں

بجھتی چنگاریوں کو کیا معلوم
راکھ کے ڈھیر میں تپیدہ ہوں

کیوں نہ لکھتا کتاب حسرت کی
کب کوئی لفظِ ناچشیدہ ہوں

دیکھ ماتم شفق کے حلقے میں
وقت کا مہرِ سر بریدہ ہوں

میری سانسوں میں عطر ہے تیرا
میں کہاں بوئے پر بریدہ ہوں
خود کبیدہ مزاج ہیں کتنے
جو سمجھتے ہیں میں کبیدہ ہوں
کون گلشن میں ساتھ دے گا میرا
صورتِ گل زباں دریدہ ہوں
گرچہ مدو جزر کی لہر ہوں میں
بحر میں راحت آفریدہ ہوں
اک ثمردار شاخ ہوں جاذبؔ
اپنے ہی بوجھ سے خمیدہ ہوں

OOO

O

کتنے ہی برس بیت گئے جان کنی ہے
ہر سانس مرے حلق میں نیزے کی انی ہے

کیسے عدم آباد کی سرحد کو پھلانگوں
رستے میں مرے جسم کی دیوار تنی ہے

حالانکہ شجر اور بھی ہیں صحنِ چمن میں
اک شاخِ ثمردار پہ کیوں سنگ زنی ہے

ہر لہر کے ہاتھوں سے ہٹے راہ کے پتھر
سیلابِ ستم خیز ارادے کا دھنی ہے

اُٹھے تو کرے دھوپ میں میلوں کی مسافت
بیٹھے تو مسافر کے لیے چھاؤں گھنی ہے

اک ضرب سے ہی کاٹ دیا کوہِ سیہ شب
یہ تیشۂ خورشید کی کم کوہ کنی ہے

میں فکرِ براھیم ہوں آذر تو نہیں ہوں
میری تو ہمہ وقت ہر اک بت سے ٹھنی ہے

کیونکر نہ ہمہ وقت کروں اُس کی تمنا
احساس کی دیوی مرے ہاتھوں میں جنی ہے

محفل میں لُٹا بیٹھا ہے اشکوں کا خزانہ
جاذبؔ بھی تو حاتم کی طرح دل کا غنی ہے

O

اس نے ہر بار ڈسا ہے مجھے ناگن کی طرح
آستینوں میں جو رہنے لگا ساجن کی طرح

اپنی منزل کی طرح ڈھونڈھتا ہر بار اسے
جس نے دیکھا نہ پلٹ کر مجھے بچپن کی طرح

ظلمتیں دور سے تکتی رہیں چہرہ اس کا
شبِ یلدا میں جو روشن مہِ روشن کی طرح

کان میں گھولتی ہے رس تری آوازِ خرام
تری آہٹ بھی ہے پازیب کی چھن چھن کی طرح

ہنستے پھولوں کی صبا نے مجھے مہکانا ہے
ٹہنیاں آنکھ کی آباد ہیں گلشن کی طرح

مجتمع کرتا رہا بکھرے ہوئے لمحوں کو
آس کے کھیت میں بکھرے ہوئے خرمن کی طرح

سرخ ہاتھوں کے تبّر کا یہ کرشمہ کم ہے
پیڑ کا پیڑ بنا ڈالا ہے ایندھن کی طرح

عین ممکن ہے کسی روز کوئی آ جائے
منتظر رہتا ہوں اجڑے ہوئے آنگن کی طرح

اپنے جوڑے میں ستاروں کا جڑاؤ کر کے
آج شرمانے لگی جھیل بھی دلہن کی طرح

وہ بھی کہتا ہے کسی راکھ کی چنگاری ہو
جو مجھے خود ہی جلاتا رہا ایندھن کی طرح

مری آنکھوں سے جوئے شیر نہ ٹپکی جاذبؔ
حادثے پڑتے رہے تیشۂ کوہکن کی طرح

OOO

O

ڈھلکا میرے چہرے پہ تو اخگر کی طرح تھا
آنسو جو چمکتے ہوئے گوہر کی طرح تھا

ڈالی جو نظر گھر پہ تو صحرا نظر آیا
صحرا کو جو دیکھا تو مرے گھر کی طرح تھا

جو وقفۂ احساس مجھے کر گیا زخمی
وہ وقفۂ احساس بھی نشتر کی طرح تھا

آنکھوں کی تجوری میں چھپا کر اسے رکھا
جو اشکِ الم قیمتی زیور کی طرح تھا

سانسوں کی سرائے میں مرے جسم کا پیکر
مہمان کے لپٹے ہوئے بستر کی طرح تھا

حالات کے تیروں سے بجھی پیاس اسی کی
جو کل لبِ ساحل علی اصغر کی طرح تھا

ہر وار چلا ہے مری ہستی کے گلے پر
ہر وار مری سانس کا خنجر کی طرح تھا

اجڑے ہوئے دیہات کی پگڈنڈی ہو جیسے
راہِ شب یلدا رہِ ابتر کی طرح تھا

جاذبؔ تجھے کس طرح لگی جونک غموں کی
اے دوست بدن تیرا تو پتھر کی طرح تھا

OOO

O

جو پیاس کے صحراؤں میں خود دار رہا ہے
بہتے ہوئے پانی سے وہ بیزار رہا ہے

جو قریۂ شاہی میں رہا مردِ انا کیش
وہ طوق و سلاسل میں گرفتار رہا ہے

ہر شخص نشانہ ہے ترے طرزِ ستم کا
ہر شخص وفاؤں کا علم دار رہا ہے

لقمے کی طرح ڈوبتے سورج کو چبایا
حلقومِ شفق شام سے خونخوار رہا ہے

چھالوں نے ہٹائے ہیں مری راہ کے پتھر
اک عمر سے رستہ مرا ہموار رہا ہے

اک عمر سے آسان تھی سانسوں کی مسافت
خود جسم مرا راہ کی دیوار رہا ہے

اس ابرِ کرم نے مجھے ژالوں سے نوازا
میرا ہی مکاں شہر میں مسمار رہا ہے
اس نے مجھے جینے کا سلیقہ بھی سکھایا
جو میرے لیے در پئے آزار رہا ہے
سورج کی شعاعوں میں کہیں برف ہو جیسے
کتنا ہی خنک سایۂ اشجار رہا ہے
دیکھا جو کہیں ایک مسافر کو جھلستا
بے تاب کہاں سایۂ اشجار رہا ہے
گو پھول کی صورت ہوں سرِ خارِ مغیلاں
اونچا ہی مرا طرۂ دستار رہا ہے
اک تو کہ سحر بیز گجر سے بھی نہ جاگا
جاذبؔ رہِ احساس میں بیدار رہا ہے

000

O

گرا نظر سے تو پل میں بکھر گیا اک شخص
خود اپنی موت سے پہلے ہی مر گیا اک شخص

اب اپنی آنکھ سے اس کی وفا کا جشن بھی دیکھ
کہا تھا تو نے تو جاں سے گزر گیا اک شخص

تھی روشنی کے جزیروں کی آرزو کتنی
سیاہیوں کے بھنور میں اتر گیا اک شخص

دیارِ زخم میں اک عمر سے پریشاں تھا
غبارِ کرب ہٹا کر تو نکھر گیا اک شخص

نجانے کس لیے انگلی پکڑ کے خوشبو کی
سحر سے پہلے گلابوں کے گھر گیا اک شخص

لہو کا پیڑ اگا کر بدن کے آنگن میں
وفا کے دشت کو سیراب کر گیا اک شخص

لکھا ہے چاند کی تختی پہ اب بھی نام اس کا
اک ایسا کام زمانے میں کر گیا اک شخص

خود اپنے آپ سے وہ اس قدر حراساں تھا
خود اپنے آپ سے اک روز ڈر گیا اک شخص

تمام شہر اسی المیے پہ نادم ہے
تمام شہر میں فاقوں سے مر گیا اک شخص

اداس رات کی چادر لپیٹ کر جاذبؔ
جدھر تھا شہرِ خموشاں ادھر گیا اک شخص

OOO

O

شعلوں سے شعاعوں سے بگولوں سے لڑا ہوں
صحرا کی طرح سینۂ گیتی پہ پڑا ہوں

صرافِ چمن ہی مجھے پہچان سکے گا
شبنم کی طرح گل کی انگوٹھی میں جڑا ہوں

کس طرح بچائے گا مجھے دھوپ سے سورج
میں برگدِ احساس کے سائے میں کھڑا ہوں

آئینۂ منزل ہوں مجھے غور سے دیکھو
اک سنگ ہوں سڑکوں کے کنارے پہ گڑا ہوں

تسلیم کہ ٹوٹی ہوئی کشتی کا ہوں تختہ
ساحل کے لیے تند تھپیڑوں سے لڑا ہوں

ہے میرے ہی قبضے میں دو عالم کی کلائی
سر مست ملنگوں کا جہانگیر کڑا ہوں

آخر مجھے گرنا ہے سرِ دامنِ ہستی
آنسو کی طرح وقت کی پلکوں میں اڑا ہوں

خود آئے گا چل کر کبھی دیوار کا سایا
اس آس پہ میں دھوپ کے آنگن میں کھڑا ہوں

مانا کہ ترے پاس ہے قارون کی دولت
فن کار ہوں میں تجھ سے بہر حال بڑا ہوں

جاذبؔ نہ مری پختگیٔ فن کا گلہ کر
جو آنچ سے پک جائے وہ آوے کا گھڑا ہوں

OOO

O

اب تو غمِ جراحتِ احساس ہی نہیں
محسوس ہو رہا ہے کہ دل پاس ہی نہیں

بنجر وہ دل کہ جس میں نہیں کوئی نخلِ غم
پتھر وہ آنکھ جس میں کوئی آس ہی نہیں

کس آس پہ گزار دوں عمرِ دراز کو
جب کاٹنے کے واسطے بن باس ہی نہیں

کب تک میں اپنی سانس کے سکے چلاؤں گا
قرضے کی زندگی تو مجھے راس ہی نہیں

دیکھیں اگر تو کتنے گھروندے ہیں کرب زا
سوچیں تو کوئی قریۂ افلاس ہی نہیں

کرچیں غموں کی روح میں اتری ہیں کس لیے
چیلوں کے گھونسلے میں کہیں ماس ہی نہیں

دریا سے جتنا دور تھا لب خشک تھے مرے
کشتی میں بیٹھ کر تو کوئی پیاس ہی نہیں

اُڑتے ہوئے غبارِ سے وہ اٹ چکا نہ ہو
اب دل کا آئینہ ترا عکاس ہی نہیں

کیا سوچ کے کرو گے تعاقب حیات کا
لمحوں کو ناپنے کو تو مقیاس ہی نہیں

پھولی ہے کیسے روشنی پھولوں کی مانگ میں
جب گلستاں میں شبنمی الماس ہی نہیں

اقدارِ زندگی پہ ہو تنقید کس طرح
جاذبؔ سا منچلا سرِ اجلاس ہی نہیں

OOO

O

شاخوں میں نہاں تسمۂ فتراک ملا ہے
گو طائرِ پرّاں سرِ افلاک ملا ہے

ہر وادیٔ حزیاں میں ہیں اشکوں کے تلاطم
اس عہد کو کیا دیدۂ نمناک ملا ہے

ممکن ہے بھنور سے ہو کبھی دست و گریباں
لہروں سے جو خائف تھا وہ تیراک ملا ہے

کھولے جو محاذ آندھی ، نہیں خوف ذرا سا
فانوس کا ہر دیپ تو بیباک ملا ہے

ساحل پہ وہ جاتا ہے کہاں سیپیاں چننے
بچہ بھی ترے شہر کا چالاک ملا ہے

ممکن ہے کہ لپٹوں سے جھلس جائیں مرے ہاتھ
گلشن کا ہر اک پھول شرر ناک ملا ہے

سیلابِ شفق اس کو بجھا کر ہی رہے گا
سورج کو اگر دیدۂ خوںناک ملا ہے

یہ کب ہے مرے بس میں کسی ذات کو پرکھوں
مجھ کو تو فقط اپنا ہی ادراک ملا ہے

اس نے سرِ ساحل کے گھروندوں کو نہ چھوڑا
اس بار تو سیلاب خطرناک ملا ہے

ظلمت کے تلاطم سے مجھے جس نے بچایا
ممدد ہی مرا صاحبِ لولاک ملا ہے

OOO

O

کون کہتا ہے کہ ظلمت کا ازالہ ہوگیا
مہر کیا ابھرا فضا کا رنگ کالا ہوگیا

سب ستارے ہضم کر کے بھی سحر بھوکی رہی
جگمگاتا چاند بھی اس کا نوالہ ہوگیا

حبس کے ہاتھوں ہواؤں کی زبانیں کٹ گئیں
پتا پتا پیڑ کے ہونٹوں کا تالا ہوگیا

کاش صحرائے فلک میں کوئی اس کو دیکھتا
چاند گھر کے ابر میں چشمِ غزالہ ہو گیا

زندگی کے موڑ پر بکھری پڑی تھیں کرچیاں
ہر مسافر سانس کے پاؤں میں چھالا ہوگیا

جانے کس سقراط کی آمد ہے صحنِ باغ میں
زہر سے لبریز ہر گُل کا پیالہ ہوگیا

روشنی مانگی تو جگنو پر سمیٹے اُڑ گئے
ایسی سستی جنس کا بھی نرخ بالا ہوگیا

میرا قد میرے قلم نے اور اونچا کر دیا
ریزہ ریزہ ہو کے میں کوہِ ہمالہ ہوگیا

اتفاقاً یوں مری آنکھوں سے پھوٹی ہے کرن
اک ولی کی قبر میں جیسے اجالا ہوگیا

ابر کا احساس جاذبؔ قابلِ تحسین ہے
جو سلگتی ریت کے تن کا دو شالہ ہوگیا

OOO

O

زندگی بھر میں غموں کے تیل میں جلتا رہا
وقت مجھ کو ایک مچھلی کی طرح تلتا رہا

میرا ہر اک زخم ہے اُس نخلِ خودرو کی طرح
جو کسی بنجر زمیں میں پھولتا پھلتا رہا

حادثوں کا وار بھی کتنا اذیت ناک تھا
میری گردن پر درانتی کی طرح چلتا رہا

یاس کی پرچھائیوں کو دور کرنے کے لیے
قہقہوں کا نقرئی غازہ کوئی ملتا رہا

کرب کی چکی میں رہ کر اس طرح زندہ ہوں میں
کرم جیسے پتھروں کے پیٹ میں پلتا رہا

محتسب خاموش ، واعظ گنگ ، دنیا چپ رہی
جسم کا سکّہ سرِ بازار ہی چلتا رہا

آندھیاں معمور تھیں جس کو بجھانے کے لیے
وہ دیا محرابِ دل میں رات بھر جلتا رہا

میں وہ نخلِ آرزو ہوں گلستانِ دہر کا
جس کا ہر پتا کفِ افسوس ہی ملتا رہا

دائرے سے اک قدم اس کا نہ باہر جاسکا
بیل کولھو کا سحر سے شام تک چلتا رہا

وہ ستارا ہے مری تقدیر کا جاذبؔ نقیب
جو تبسم کے افق سے رات بھر ڈھلتا رہا

OOO

O

جس کے لہجے میں انا بھی ہو گی
اس پہ اک روز جفا بھی ہو گی

ابرزاروں میں ہے جو رقصِ طرب
ان حبابوں میں ہوا بھی ہو گی

عین ممکن ہے عدالت سے کبھی
کسی مجرم کو سزا بھی ہو گی

کیا کبھی قیدِ قفس ٹوٹے گی
روح عنصر سے رہا بھی ہو گی

قصرِ گلگوں سے جو نکلی خوشبو
رازداں بادِ صبا بھی ہو گی

آنکھ کی کچی ہے گر آبادی
پھر مکینوں پہ جفا بھی ہو گی

لب شہنائی پہ ہیں نغمانے
کہیں تقریبِ حنا بھی ہوگی

طائرِ فکر نہیں لب بستہ
زیرِ منقار نوا بھی ہو گی

دار پر صرف وہی گونجیں گے
جن ارادوں میں انا بھی ہو گی

گو حدی خوان سنیں یا نہ سنیں
چیختی بانگِ درا بھی ہو گی

سجدۂ آخرِ شب میں جاذبؔ
کانپتے لب پہ دعا بھی ہو گی

OOO

O

ہوں گے نکہت سے باخبر جب لوگ
چوم لیں گے گلاب کے لب لوگ

شبنمی بارگاہ میں شاید
آنسوؤں کے ہیں منتخب اب لوگ

جستجو ہے نئے نگینوں کی
تیرگی چھانتے ہیں ہر شب لوگ

جا بجا ڈنک کھائے جاتے ہیں
قریہ قریہ ہیں نیشِ عقرب لوگ

پھر سے مہتاب کی ضرورت ہے
پھر سے ڈھونڈھیں گے چاہِ نخشب لوگ

عصرِ حاضر میں تشنگی اتنی
پی رہے ہیں لہو کے مشرب لوگ

آبگینے جو چور چور ہوئے
اس پہ نمناک بھی ہوئے کب لوگ

غمزدوں کے ورق ورق قصےّ
جانے کس دن کریں مرتب لوگ

بھوک کے گنگناتے میلے میں
خوب دکھلا رہے ہیں کرتب لوگ

یہ غنیمت ہے عہدِ گریاں میں
ہنس بھی لیتے ہیں آج ہم سب لوگ

کوئی تدبیر ان کے بچنے کی
کھائیوں میں گرے ہیں یارب لوگ

مسجدیں آج محوِ حیرت ہیں
اب فرشتوں کے ہیں مقرب لوگ

یہ نہ ہاروت ہیں نہ ہیں ماروت
چاہِ بابل میں کس لیے اب لوگ

لکھ رہے ہیں سنہری لمحوں کو
کیسی تحریر کے ہیں کاتب لوگ

میں چلا کرچیوں کی راہوں پر
ہوں گے کب میرے ہم سفر سب لوگ

نوکری بھی ہو باوقار بھی ہو
مانگتے پھر رہے ہیں منصب لوگ

پھر سے ہونا ہے ذوالفقارِ بکف
خیبرِ مکر میں ہیں مرحب لوگ

بارشِ سنگ سے بچیں جاذبؔ
اپنے واقف نہیں یہاں اب لوگ

ooo

O

لوگ زیرِ عتاب آتے ہیں
پھر کہیں انقلاب آتے ہیں

ریت اُڑتی ہے دشتِ ایماں سے
پھر مسلسل عذاب آتے ہیں

ہنہنائے جو رخشِ یاس کبھی
زخم پادر رکاب آتے ہیں

جن کی تعمیر ساحلوں پہ ہوئی
گھر وہی زیرِ آب آتے ہیں

آئینے جب کوئی سوال کریں
پتھروں کے جواب آتے ہیں

جب بھی کھولیں کتابِ تیرہ شبی
ہنستی کرنوں کے باب آتے ہیں

کیوں نہ اِلقا کی روشنی مہکے
صاحبانِ کتاب آتے ہیں

مکتبِ گلستان میں اب تک
طفلِ خوشبو مآب آتے ہیں

محفلِ اشک زار میں اب تو
آدمی لا جواب آتے ہیں

اور بڑھتی ہے تشنگی اپنی
جب سمندر کے خواب آتے ہیں

مہرِ تاباں جو بام پر مہکے
حسن کے انقلاب آتے ہیں

چرخ کا دل بھی ٹوٹ جاتا ہے
سر کے بل جب شہاب آتے ہیں

موسلا دھار بارشوں کے سبب
دشت بھی زیرِ آب آتے ہیں

گلستاں سرخ پوش لگتا ہے
شاخ پر جب گلاب آتے ہیں

فکرِ نو کی اداس نظروں میں
وہم زیرِ نقاب آتے ہیں

ابر رونے لگا خلاؤں میں
پانیوں پر حباب آتے ہیں
چند چڑیوں کی چہچہاہٹ پر
خود جھپٹ کر عقاب آتے ہیں
پیچھے پیچھے ہیں ملگجی سائے
سامنے آفتاب آتے ہیں
اس بڑھاپے میں تیرے شاعر کو
کس جوانی کے خواب آتے ہیں
گل جبینوں کی قبر پر جاذبؔ
مسکراتے گلاب آتے ہیں

OOO

O

احساس کی کھیتی کو نہ سیراب کہا کر
جو اشک گرے آنکھ سے زہراب کہا کر

رونے سے کہاں چیتھڑے اتریں گے بدن سے
ہنس ہنس کے انہیں اطلس و کمخواب کہا کر

کب غرق ہوئے ریت کے دریا میں سفینے
صحرا کے بگولوں کو نہ گرداب کہا کر

اب پیاس کی شدت کا مداوا ہے اسی میں
چلو بھی میسر ہو تو سیلاب کہا کر

گھر پھونکنے والے یہ تجھے کس نے کہا تھا
دہکے ہوئے خورشید کو برفاب کہا کر

سجتے ہیں یہاں جھوٹ پہ تحسین کے تمغے
پتھر کو یہاں گوہرِ نایاب کہا کر

گر تیری بصارت میں ذرا سا بھی نہیں دم
روتے ہوئے چہرے کو بھی شاداب کہا کر

احساس کی رم جھم سے کہاں پیاس بجھے گی
بھیگے ہوئے صحراؤں کو بے آب کہا کر

اس دور کا معیار ہے نا چیز نوازی
جاذبؔ یہاں جگنو کو بھی مہتاب کہا کر

OOO

O

چونک اُٹھتے ہیں ہوا کی چاپ سے
جب سے وابستہ ہوئے ہیں آپ سے

حادثوں سے اس طرح مانوس ہوں
جس طرح مانوس بچہ باپ سے

چاند تو پلنے لگا ہے پیٹ میں
رات لرزیدہ ہے کالے پاپ سے

چاپ کرنوں کی صدا برگوش ہے
جانے کیونکر آپ ہیں چپ چاپ سے

شخصیت تھی آئینہ کردار کا
شخصیت پرکھی گئی ہے ماپ سے

ہو کے رقصاں وجد میں آنے لگی
گوری ڈھولک کی سریلی تھاپ سے

ایسے لرزیدہ ملا نجمِ سحر
کانپتا ہے جسم جیسے تاپ سے

قریۂ احساس سے لرزاں ہیں ہم
جس طرح عفریت منتر جاپ سے

مصلحت کے سانپ لہرانے لگے
لوگ لب بستہ ہیں چپ کی چھاپ سے

برف سے اُڑنے لگا ہے یوں دھواں
جیسے آلودہ ہَوا ہو بھاپ سے

آپ جاذبؔ کچھ نہ کچھ تو بولیے
لوگ کچھ کہنے لگے ہیں آپ سے

ooo

O

تیغِ احساس سے خود آپ ہی کٹ جاتا ہے
ذات کے خول میں جو شخص سمٹ جاتا ہے

صرف الٹی ہوئی قسمت کا یہ معمول نہیں
سانپ جس وقت بھی ڈستا ہے الٹ جاتا ہے

ڈھیر ہو جاتے ہیں بستی کے گھروندے جس وقت
زور بڑھتے ہوئے سیلاب کا گھٹ جاتا ہے

اتنا رویا ہوں کہ اب آنکھ میں آنسو ہی نہیں
ابر جب کھل کے برستا ہے تو چھٹ جاتا ہے

کس کی جرأت ہے چلے وقت کی پگڈنڈی پر
اژدھا کیوں نہ ہو اس راہ سے ہٹ جاتا ہے

ہر کوئی تولتا ہے اپنے ترازو میں اسے
نقش تقدیر کا ہر ہاتھ میں بٹ جاتا ہے

پیار کی دھوپ کے مانوس سفر میں اکثر
مرا سایہ مرے قدموں سے لپٹ جاتا ہے

اپنی تسخیر کا جس وقت بھی آتا ہے خیال
آدمی اپنے مقابل بھی تو ڈٹ جاتا ہے

کتنا نازک ہے مری سانس کا قرطاس محل
یہ غبارہ تو ذرا پھونک سے پھٹ جاتا ہے

خوب ہے دھوپ میں یہ پیڑ کی چھاؤں کا خلوص
جو سرِ راہ مسافر سے لپٹ جاتا ہے

ان کے جلوؤں کو کہاں تک کوئی دیکھے جاذبؔ
آئینہ غازۂ رخسار سے اٹ جاتا ہے

OOO

O

راہرو جب بھی راہ سے بھٹکے
کب منازل کے پاس سے پھٹکے

نخل پر جب پڑے تبّر پیہم
شاخچے بھی گرے ہیں کٹ کٹ کے

پھر سے بھیگی ہیں آس کی پلکیں
سر پہ گرجا ہے ابرِ غم چھٹ کے

یوں رہا سانس کی انی پر میں
جیسے کوئی کھجور میں اٹکے

ذات اپنی ہے برسرِ پیکار
کر رہا ہوں مقابلہ ڈٹ کے

اپنے اوسان ہو نہ جائیں خطا
پے بہ پے ہیں ضمیر کے جھٹکے
جو نہیں وقت کی کتابوں میں
آ گیا ہوں وہی سبق رٹ کے
آج تک تختۂ شعور پہ ہوں
لاش سولی پہ جس طرح لٹکے
باقی حصہ تو برقرار ملے
ایک شانہ تو گر گیا کٹ کے
ایسی ٹپ ٹپ ہے اشک ریزوں کی
چھت سے برسات جس طرح ٹپکے
ڈالنی ہے کمند تاروں پر
اے کمر باندھ عزم کے پٹکے

آج تک ہوش کب سلامت ہیں
وقت نے اس قدر دئے جھٹکے
بات حق کی زباں پہ یوں اٹکی
جس طرح سانس حلق میں اٹکے
اب تو ہے زلزلوں کی افزائش
زندگی بھر نہ کھائے تھے جھٹکے
گنگناتی ہے ایسے تنہائی
جیسے سرگم سریلے راہٹ کے
پھر بھی تشنہ لبی کا غوغا ہے
سامنے ہیں ہرے بھرے مٹکے
چاندنی آگئی چھما چھم چھم
کتنے چرچے ہیں اُس کی آہٹ کے

چاند ، سورج ، سحر ، گہر جگنو
استعاروں میں رہ گئے بٹ کے
پیکرِ حسن کے لیے اب تک
چاہِ کنعاں میں ڈول بھی لٹکے
درسِ گلشن کے عطرزا جھونکے
چند الفاظ آ گئے رٹ کے
اس نے کھڑکی سے پھول پھینکا ہے
لوگ کوچے میں آ گئے ڈٹ کے
آخری وقت میں ترے جاذبؔ
خواہشوں کی صلیب پر لٹکے

OOO

O

ممکن نہیں کہ ظلم کا دفتر سمیٹ لوں
اپنے لہو کی صف تہِ خنجر سمیٹ لوں

یہ خوف ہے کہ بانجھ نہ ہو جائے تشنگی
ورنہ تو میں پروں میں سمندر سمیٹ لوں

تعمیر کر نہ تاج محل میری راہ میں
آندھی ہوں ایک پل میں کئی گھر سمیٹ لوں

مدو جزر سجائیں نہ لہروں کی مانگ میں
اگلے ہیں سیپیوں نے جو گوہر سمیٹ لوں

اب آچکی ہیں وسعتیں میری گرفت میں
اب تو کہے تو پھیلے ہوئے پر سمیٹ لوں

مہتاب تھک کے رات کے آنگن میں سو گیا
چپکے سے جا کے ریشمی چادر سمیٹ لوں

پھر کاروانِ فکر کو ٹھوکر نہ لگ سکے
بکھرے ہیں راستے میں جو پتھر سمیٹ لوں

تاباں ہیں آسمان پر ماہتاب و آفتاب
تابانیوں کو اپنے ہی در پر سمیٹ لوں

جاذبؔ سلگتا مہر مرے سر پہ آگیا
چپ چاپ اپنی سانس کا بستر سمیٹ لوں

OOO

O

جرم سرزد ہو گیا حق بات کا
میں بھی اک مجرم ہوں اپنی ذات کا

کس لیے کچے مکانوں پر ستم
کوئی تو پہلو ہو مثبت بات کا

واہموں کی مکڑیاں ہیں دم بخود
کون جالا بن گیا لمحات کا

منطقہ حارہ کا اک منشور ہے
مہر ہے پابند ان درجات کا

یاوہ گوئی کس لیے صحراؤں میں
بند کوئی منہ کرے برسات کا

وقت کے ہر ہاتھ میں پرکار ہے
دائرہ کھلنا ہے ترجیحات کا

شام کا دامن لہو سے تر ملا
مہر کا مقتل ہے آنگن رات کا

جل کے خاکستر ہوئے ہیں جسم و جاں
شعلہ جب لپکا ہے احساسات کا

خوشبوؤں کے سر پہ کوئی ہاتھ ہو
پھول تو مہمان ہے لمحات کا

یوں ستاروں میں شہِ خوبان ہے
جیسے دولہا ہو کسی بارات کا

شاخِ ہستی کا گلابِ گلستاں
ہے کھلونا تتلیوں کی ذات کا

ابر کی مشکیں بھی دریا پر کھلیں
دشت منہ تکتا رہا برسات کا

نت نئے چہرے ابھرتے جائیں گے
کیا بھروسہ آئینوں کی ذات کا

ظلمتوں کا رقصِ عریاں دیکھنا
جب حجاب اترے دمکتی رات کا

موسموں کا زہر کڑوی آندھیاں
دل دھڑکتا ہے شجر کے پات کا

اب بگولا بھی حواری بن گیا
دشت کے جھلسے ہوئے ذرات کا

اس لیے تالے ہیں میرے ہونٹ پر
مسئلہ ہے دار کی اوقات کا

ہو گئے آباد جوہڑ شہر کے
میڈکیں لیں گے مزا برسات کا

مسکراتی جھیل رکھے گی خیال
جگنوؤں کی تیرتی بارات کا

میں سویرا ہوں فقط اس آنکھ میں
جس میں کاجل ہے سمٹتی رات کا

اب بگولا بن گیا ہے راز داں
درد سے اُڑتے ہوئے ذرّات کا

آگیا ہوں خیرگی کے شہر میں
کب سے متلاشی تھا روشن ذات کا

اس میں سورج کی خطا کوئی نہیں
ہر ستارہ خود ہے قاتل رات کا

اپنے سائے سے رہا ہوں بے خبر
حادثہ یہ کم نہیں حالات کا

ہے درانتی ہر حنائی ہاتھ میں
حشر کیا ہو گا ہری فصلات کا

چاندنی شب نے نچوڑا ہے بدن
کون چکھے گا مزہ برسات کا

سرخرو دیوار اس مقتل کی ہے
دیپ روشن ہے جہاں حق بات کا

کیا کرے پروین و زہرہ پر نظر
وہ عطارد ہے نئے جذبات کا

ابرِ یخ بستہ برستا ہے جہاں
وہ جزیرہ ہوں غمِ حالات کا

اُٹھ رہی ہیں انگلیاں تنقیص کی
حشر یہ ہے اپنی تخلیقات کا

کس طرح میں چھوڑ جاؤں نقشِ پا
کون قائل ہے مری خدمات کا

کہکشاں کی سیج بھی تیار ہے
چاند گر دولہا ہے منکوحات کا

اپنے بچوں کا بھی کر جاذبؔ خیال
دائرہ کم کر تعلقات کا

OOO

O

تند دریا نے کچھ ایسی بات کی
بندھ گئی ہیں ہچکیاں برسات کی

آ گئی جھرنوں کی سنگت خیر سے
آج تو بوچھاڑ ہے نغمات کی

جانے کس دربار میں فریاد ہے
دم بخود زنجیر ہے حالات کی

اس کے چہرے پر لکیروں کی پھبن
جیسے وہ تحریر ہو تورات کی

کس قدر بوڑھی صدی پر بوجھ ہیں
اکھڑی سانسیں ہانپتے لمحات کی

اس کی ہر اک سانس میں سانپوں کا بس
جس نے جنگل میں بسر اک رات کی

پھول ہیں تیار جانے کے لیے
شاخ کے سر گٹھڑیاں حالات کی

دھوپ نے توڑی ہیں اس پہ برچھیاں
دشت نے تعریف کی تھی رات کی

مہر چند ہی ساعتوں میں مر گیا
جانے کیا ایسی شفق نے بات کی

کیا بِگھرے ہم کوچۂ گرداب میں
گالیاں سنتے رہے بدذات کی

جس طرح تیرہ گھپاؤں میں دیا
روشنی بے فیض آدھی رات کی

چاند کی کرنوں کی دھن مسحور کن
جیسے شہنائی کسی بارات کی

گدگدی یوں کی ہَوا نے ابر کی
کِھل گئیں باچھیں بھری برسات کی

آنکھ کو رکھتی ہیں جاذبؔ پر سکوں
چاندنی راتیں مرے دیہات کی

OOO

O

صداقتوں کے تحفظ میں سخت بولیں گے
ہوئے جو نرم بھی لہجے کرخت بولیں گے

زبان رکھتے ہوئے برگ و بار گونگے ہیں
جو لب ہوا کے ہلے تو درخت بولیں گے

جو رہزنوں نے سرِعام آ کے لوٹ لیے
عدالتوں میں وہی سازو رخت بولیں گے

لکھا ہوا ہے جبینوں کی تختیوں پہ یہی
چمک اُٹھے ستارے تو بخت بولیں گے

زبان کٹ بھی گئی انگ انگ چہکے گا
جو گنگ ہو بھی گئے لخت لخت بولیں گے

سنا ہے اب نئے الفاظ دے گئی آندھی
نئی دلیل سے اب کے درخت بولیں گے

اک ایسا دور بھی جاذبؔ مری نظر میں ہے
نہ تاج دے گا صدائیں نہ تخت بولیں گے

OOO

O

نازک دلوں سے آئینے چٹخے تڑاخ سے
تو نے گرائے پھول جو ہونٹوں کی شاخ سے

میرا جگر تھا طے کیا کہسارِ "بیستوں"
گزرے تو کوئی ایسی رہِ سنگلاخ سے

لاوا دلِ غریب سے پھوٹا ہے اس طرح
ٹکرا گئے ہیں جھونپڑے شاہوں کے کاخ سے

گو جھونپڑا ہو اس میں میسر سکون ہو
بے چینیوں کا ربط ہے شاہوں کے کاخ سے

سانسوں کے سلسلوں سے میں لف اس طرح ہوا
چمٹا ہو جیسے برگ کسی سبز شاخ سے

اس کی رگِ حیات میں کس کس کا ہے لہو
پوچھے کوئی شفق کی جبینِ فراخ سے

جاذبؔ سمجھ رہے ہیں مقدر کی تیرگی
لپٹا ہوا ہے دیر سے سرمہ سلاخ سے

000

O

میں ہمالہ ہوں انا کا ثانیِ الوند ہوں
تو ہے گر بپھرا ہوا طوفاں تو میں اک بند ہوں

پیار سے جس کو مشیت لوریاں دیتی رہی
مادرِ فطرت کا میں وہ لاڈلا فرزند ہوں

ہے مری آنکھوں کے ساغر میں مئے افلاس کی
قہقہوں کے شہر میں رہ کر کہاں خورسند ہوں

اک بھنور ہوں قفل پانی کے لگے ہیں اردگرد
تند لہروں کی سلاخوں میں ابھی تک بند ہوں

مجھ پہ جاذبؔ اس لیے ہے مہر زادوں کا ستم
دھوپ کے دامن پہ ٹھنڈی چھاؤں کا پیوند ہوں

OOO

O

جو حالات سے ڈر جاتے ہیں
وقت سے پہلے مرجاتے ہیں

شاخ سے گرتے گرتے پتے
بات انوکھی کر جاتے ہیں

طائر کتنے گھر سے نکلے
واپس کتنے گھر جاتے ہیں

کچھ زندہ رہتے ہیں مر کر
کچھ جیتے جی مر جاتے ہیں

بوسیدہ ٹکڑوں اب تو
خالی کاسے بھر جاتے ہیں

اب تو ناخن کی ضربوں سے
زخم بدن کے بھر جاتے ہیں

گلدانوں میں ہنستے ہنستے
تازہ پھول بکھر جاتے ہیں

فاقہ مستی کے صحرا میں
بوذر سے بے زر جاتے ہیں

پکتے پھل ہوں جس آنگن میں
اُس گھر میں پتھر جاتے ہیں

شبنم کی تازہ مرہم سے
زخم گلوں کے بھر جاتے ہیں

چند سفینے دریاؤں سے
خود چپ چاپ گزر جاتے ہیں

اب چاندی کی دہلیزوں پر
خود سر دے کر سر جاتے ہیں

خشک تنے کے لاغر چھلکے
اپنے آپ اتر جاتے ہیں

جاذبؔ اک دن بوڑھے سر سے
سانس کے بوجھ اتر جاتے ہیں

OOO

O

گرد چہرے کی صاف کر لیتا
ہاتھ میں آئینہ اگر لیتا

جب بھی کرتا کوئی دیا روشن
وقت سازش ہوا سے کر لیتا

طے جو کرنا تھی رات کی گھائی
ہاتھ میں مشعلِ قمر لیتا

وہ صباؤں سے مشورہ کر کے
سرخ پھولوں کے کان بھر لیتا

پھول تو ہو چکے ہیں نذرِ خزاں
تتلیوں کی کوئی خبر لیتا

نغمۂ "بیستوں" کی دھن تھی اگر
بربطِ تیشۂ ہنر لیتا
گر تھا عطار وہ گلابوں کا
اپنی سانسوں میں عطر بھر لیتا
کب سے ویران ہیں مری پلکیں
خشک پیڑوں سے کیا ثمر لیتا
لکھ رہا تھا وثیقۂ یاراں
دستخط آنسوؤں کے کر لیتا
حق پرستوں کا تذکرہ تو نہ تھا
جاں ہتھیلی پہ کیسے دھر لیتا
راہِ ہستی میں تھی کٹھن جاذبؔ
ساتھ کوئی تو ہمسفر لیتا

OOO

O

سفر کی چلچلاتی دھوپ میں گر ہمسفر ہوتا
ذرا آرام کر لیتے جو رستے میں شجر ہوتا

چراغاں اس کو کر لیتا میں چھالوں کے چراغوں سے
بھانک رات کی صورت کوئی جو رہگزر ہوتا

سرِ راہِ محبت ایک گنبد کی طرح تھا وہ
کوئی جو اس کا در ہوتا تو کیوں کر دربدر ہوتا

میں ہوں مہرِ رسیدہ ریگ کے ذرّات کی صورت
ترے سایے میں آجاتا ترا سایہ اگر ہوتا

کوئی سہ شاخہ ناوک اب نہ کھنچتے ہی خطا ہوجائے
بناتا گر ہدف مجھ کو نہ میں سینہ سپر ہوتا

بہاریں اپنے ہاتھوں سے چمن میں آگ بھڑکاتیں
بہاروں کی محافل میں صدا رقصِ شرر ہوتا

ہمیشہ کھیلتا جلووں کی نکھری کجلی زلفوں سے
دمکتی کہکشاؤں میں اگر میرا سفر ہوتا

سلگتی دھوپ میں آتا ہرے پیپل کی چھاؤں میں
مہکتی گدگداتی چھاؤں میں وہ بھی اگر ہوتا

جھکا لیتا میں ایسا سر پھرا بھی ، آستاں پہ سر
مرا سر اس طرف ہوتا ترا کعبہ جدھر ہوتا

نکھرتے رنگ جانے کتنے ہاتھوں میں بکھر جاتے
جو اڑتی تتلیوں کا رنگ بھی جاذبؔ نظر ہوتا

OOO

O

محظوظ ہو رہا ہے بشر مار دھاڑ سے
خونخوار جیسے خوش و خرم چیر پھاڑ سے

اپنی گرج سے آج بھی جانے گئے ہیں لوگ
پہچانتے ہیں فیل کو جیسے چنگھاڑ سے

رائی کی مثل سنگ اڑیں گے ہواؤں میں
تیشے کا جب بھی سامنا ہوگا پہاڑ سے

میں سو رہا تھا چین سے یادوں کی سیج پر
جب چلچلاتی دھوپ نے جھانکا کواڑ سے

کوئی برہنہ پا اسے کیسے پھلانگتا
زخمی بدن ہوئے ہیں حوادث کی باڑ سے

جن کے لیے میں دھوپ میں سایہ بنا رہا
سائے کی مثل مجھ کو گئے ہیں لتاڑ سے

ان کو ہلا کے رکھ دے نہ غربت کا زلزلہ
ڈرتے رہے ہیں شیش محل بھی دراڑ سے

پتوں کی کوئی چیخ مؤثر نہ ہو سکی
ٹوٹے ہیں نخل کتنے جڑوں کی اکھاڑ سے

تنہائیوں کی اوٹ میں خوش اہلِ فقر ہیں
جیسے ہرا بھرا رہے جنگل اجاڑ سے

جاذبؔ مجھے گمان ہے میں اس کی زد میں ہوں
پتھر لڑھک رہا ہے جو اونچے پہاڑ سے

OOO

O

بھر بھری ریت پہ محل نہ بنا
سوچ کو ریگ زارِ تھل نہ بنا

ساحلوں پر بھی پیاس اُگتی ہے
ابر کو پیاس کا بدل نہ بنا

پھول گلشن کی زیب و زینت ہیں
کسی گلدان کو سجل نہ بنا

راکھ ڈالیں گے لوگ آنکھوں میں
اشک زاروں کو گنگا جل نہ بنا

ہر طرف ٹوٹتی گھٹائیں ہیں
ریت کے گھر تو آج کل نہ بنا

سنگ زاروں میں ہے بسر تیری
تو یہاں کانچ کے محل نہ بنا

چشمِ تاریخ ہے بسیط بہت
ایک پل کو ہزار پل نہ بنا
یوں نہ ہو تتلیاں لپک آئیں
اپنے ہر زخم کو کنول نہ بنا
دیکھ بیری اگا نہ آنگن میں
اپنا گھر قریۂ اجل نہ بنا
وہ ختن زار کے غزال نہیں
نافۂ فکر کو غزل نہ بنا
تو ہے اثبات سوچ کا شاعر
اپنی سوچوں کو مبتذل نہ بنا
قہقہہ رس بھرا سہی جاذبؔ
نخلِ ہستی کا اس کو پھل نہ بنا

OOO

O

گنبدِ ذات سے اک روز نکل جاؤں گا
زندگی میں ترے اقدار بدل جاؤں گا

سانس کے شہر میں ہوں اپنی انا کا خنجر
شہ رگِ زیست پہ خود آپ ہی چل جاؤں گا

مری پلکوں کا ستارا بھی ترے کام آئے
میں کہاں لے کے ہری شاخ کا پھل جاؤں گا

ہاتھ پہ اڈی لکیروں کا میں قائل ہی نہیں
الٹی تقدیر کو خود آپ بدل جاؤں گا

تو نے یادوں کے جھروکوں سے گرایا جو مجھے
سرحدِ زیست سے میں دور نکل جاؤں گا

اے مجھے اپنی نگاہوں سے گرانے والے
اپنے قدموں میں گروں گا تو سنبھل جاؤں گا

ترے احساس نے حساس بنایا مجھ کو
پھول کی آنچ بھی آئے گی تو جل جاؤں گا

آستینوں میں چھپا بیٹھا ہے مرے ڈر سے
سانپ کا سر تو میں پل بھر کچل جاؤں گا

مجھ کو ستانے نہ دے گا جو ترے قرب کا پیڑ
اپنی ہر یاد کی کونپل کو مسل جاؤں گا

دیکھ کر ان کی نگاہوں کے نشیلے تیور
راز گزری ہوئی صدیوں کا اگل جاؤں گا

الجھی زلفوں کے جو عقدے کہیں کھلتے ہی نہیں
ان مسائل کا بھی دے کر کوئی حل جاؤں گا

اپنی تنہائی سے کچھ لے کے اُٹھوں گا جاذبؔ
آج تو موڈ میں ہوں کہہ کے غزل جاؤں گا

OOO

O

پلٹ کے آگئے شاہد جفا کے موسم پھر
ہمارے زخم کا پتھر بنے ہیں مرہم پھر

قریب ہو کے جو گزرا میں اپنی پلکوں سے
تو گنگنانے لگی بارشوں کی چھم چھم پھر

بکھر گیا ہو نہ ان گیسوؤں کا شیرازہ
کہ ہو گیا ہے نظامِ حیات برہم پھر

پھر اس کے سائے میں گھر سے نکل کے آ بیٹھے
ہماری راہ میں حائل ہوا ہے شیشم پھر

بہار آئی تو اب ہفت رنگ آئے گی
بنُے گی قوسِ قزح آنچلوں کے ریشم پھر

مجھے خوشی ہے کہ صحرا کی تشنگی تو بجھی
سفر میں پھوٹ پڑا آبلوں کا زمزم پھر

سنا ہے پھر کسی دریا میں ناؤ ڈوب گئی
سنا ہے حلقۂ گرداب میں ہے ماتم پھر

نہ جانے کس لیے اشکوں میں سینہ کوبی ہے
ہماری آنکھ کے حلقے میں ہے محرم پھر

بلا کی دھوپ میں بکھریں گے راگ دیپک کے
جو برگ و بار کے لب پر چھڑیں گے سرگم پھر

میں اس ہوا کے ارادے کو پا گیا جاذبؔ
اداس پتوں کا چھیڑا گیا ہے سرگم پھر

OOO

O

اپنی محنت کے ثمر سے آج بھی محروم ہوں
کشتِ ہستی میں کسی دہقان کا مقسوم ہوا

عین ممکن ہے دمکتے چاند سے لوں روشنی
ڈوبتے سورج کی صورت شام سے معدوم ہوں

ہر طرف خارِ مغیلاں ہر طرف بادِ خزاں
مسکراتے لالہ زاروں میں بہت مغموم ہوں

اور لے جاتے ہیں آکر میری محنت کا ثمر
شہد کی مکھی کی صورت شہد سے محروم ہوں

سیپیاں چننے کی خاطر کس لیے آئیں گے وہ
سیپیوں کے ہونٹ کا کب گوہرِ مقسوم ہوں

آج بھی ہوں میں کتابِ زندگی کا سرورق
آج بھی دیباچۂ ہستی کا اک مفہوم ہوں

میری پلکوں کے قلم نے جس کو خوش خط لکھ دیا
میں بیاضِ کرب کا وہ صفحۂ مرقوم ہوں

کینوس پر پھیلتی آڑھی لکیروں کی چبھن
چند رنگوں سے نکھرتا چہرۂ موہوم ہوں

کون ڈالے گا نظر جاذبؔ کتابِ ذات پر
جو سمجھ میں آنہیں سکتا وہی مفہوم ہوں

000

O

مری ہر موج دریا کی ہمہ دانی پہ نظریں ہیں
کنارِ پُر تکلف کی پریشانی پہ نظریں ہیں

جو کشتی لقمۂ تر جان کے بھرتے ہیں پیٹ اپنا
اسی کم ظرف گردابوں کی مہمانی پہ نظریں ہیں

صلہ رحمی کا اپنوں سے تقاضا کیا کرے کوئی
جو مر جاتا ہے آنکھوں میں اسی پانی پہ نظریں ہیں

سرِ ساحل ہوئی تعمیر جس کی وہ گھروندا ہوں
مری تو ہر گھڑی دریا کی طغیانی پہ نظریں ہیں

تمہارے جسم پر سجتا نہیں ملبوس مخمل کا
دمکتی شب تمہاری نیم عریانی پہ نظریں ہیں

جو تا لابوں سے اُٹھ کر آ گئی گہرے سمندر میں
سرِ ساحل اسی مچھلی کی نادانی پہ نظریں ہیں

جہاں سے آبشاریں پھوٹ کر وادی میں گرتی ہیں
مری جاذبؔ فقط اُس کوہِ برفانی پہ نظریں ہیں

OOO

O

ہنستا ہے ابر اشک فشانی کے باوجود
تشنہ ہے دشت آنکھ میں پانی کے باوجود

ایسی انوکھی بات کا چرچا بہت ہوا
لوٹے ہیں لوگ نقل مکانی کے باوجود

یہ اور بات پیڑ پہ دونوں کا نام ہے
بھولا ہوا ہوں یاد دہانی کے باوجود

غربت نے سارا خون نچوڑا ہے جسم سے
زندہ ہیں شہرِ یار گرانی کے باوجود

ڈوبی ہوئی نہ ہوں کہیں معصوم کشتیاں
لہریں ہیں سرد تیز روانی کے باوجود

سگرٹ کے کڑوے کش کی حلاوت تو دیکھئے
بوڑھے ہیں لوگ اُٹھتی جوانی کے باوجود

اس نے کوئی چراغ بجھایا نہ ہاتھ سے
خندہ سحر ہے لغو بیانی کے باوجود

جو حسن تھا وہ نوک پلک نے اڑا دیا
تشنہ غزل ہے مقطعِ ثانی کے باوجود

تاریکیوں نے جشن منایا ہے رات بھر
بجھتے دیے کی مرثیہ خوانی کے باوجود

جاذبؔ اک عمر ہے مری سانس گھات میں
میں جی رہا ہوں دشمنِ جانی کے باوجود

OOO

O

مہک اُٹھیں ہیں پرونیں سمٹ کے

کہاں ممکن ہے اجلا چاند بھٹکے

اگر ہو جائے کچھ ان کا اشارا

دمکتا مہر بھی آئے پلٹ کے

ستم پیپل کے پتوں پر ہوا ہے

ہَوا روئی ہے شاخوں سے لپٹ کے

کسی ناوک کی آنکھوں میں نہ آئیں

پرندے شاخ پر بیٹھے سمٹ کے

ذرا سا بخت کا سورج ڈھلا ہے

مقابل آگئے ہیں سائے ڈٹ کے

تری خاطر وہی ہے مشک و عنبر
ہوا تقسیم جو پھولوں میں بٹ کے

سہارا موت نے آ کر دیا ہے
اگرچہ سانس کی سولی پہ لٹکے

نشیلی کرچیاں گو سدِ رہ تھیں
قدم اس راہ پر اپنے نہ اٹکے

وفا کی راہ پر جاذبؔ چلے ہیں
نہ دیکھیں گے کبھی پیچھے پلٹ کے

OOO

O

وقت کا عفریت رستے سے پلٹ جائے کہیں
وہ مرا مدِ مقابل پھر نہ ڈٹ جائے کہیں

اشک ہے کرب و الم ، دکھ درد کی آکاس بیل
نخلِ ہستی سے نہ اب جا کر لپٹ جائے کہیں

بل پہ بل کھانے لگے گی چاند کی اُڑتی پتنگ
درمیاں سے دودھیا ڈوری نہ کٹ جائے کہیں

دستِ گل میزان ہے میزان میں کانٹا بھی ہے
خوشبوئے گل چند ہاتھوں میں نہ بٹ جائے کہیں

نیلگوں امبر کا نظروں میں سراپا آگیا
اب نہ تو آنکھوں کی پتلی میں سمٹ جائے کہیں

برس کے پتوں کے لب پر کرب کی چیخ و پکار
یا خدا اب آندھیوں کا زور گھٹ جائے کہیں

موجزن لہریں اچھلتی کودتی ہیں ہر طرف
تیرتی کشتی نہ دریا میں الٹ جائے کہیں

نوحہ زن صحرا کے لب پر تشنگی رہ جائے گی
ابر نے کھل کر برسنا ہے نہ چھٹ جائے کہیں

رنج و غم ، کرب و الم ، دکھ درد سے فریاد سے
ان گنت رشتوں سے اب جاذبؔ نہ کٹ جائے کہیں

OOO

فرد فرد

اک نیا لہجہ نیا آہنگ ہونا چاہیئے
سوچ میں قوسِ قزح کا رنگ ہونا چاہیئے

☆☆☆

ایسا کمسن قہقہا بھی میں نے دیکھا ہے جسے
جھولنے کو آپ کے ہونٹوں کا گہوارہ ملا

☆☆☆

میرے ماتھے پر غریبی کا نشاں دیکھے کوئی
تیر کا جیسے نشاں مشکیزۂ عباس پر

☆☆☆

کیا جو بھوک نے جاذبؔ دراز دستِ سوال
تو قہقہوں میں صدائے فقیر ڈوب گئی

☆☆☆

شجر کے کان میں جانے کہا کیا آندھیوں نے
گلے مل مل کے شاخیں دیر تک روتی رہیں ہیں

شعیب جاذبؔ کی تصانیف

1	پیاسی چھاگل پیاسے لوگ	مطبوعہ۔128ص
2	دھوپ کا سائباں	مطبوعہ۔146ص
3	قریۂ احساس	زیرِ طبع۔144ص
4	تشنۂ بادل صحرا کے	مدّون۔128ص
5	تپا مہر سلگتی چھاؤں	مدّون۔128ص
6	ستاروں سے آگے	مدّون۔128ص
7	نالۂ غزل	مدّون۔144ص
8	بستی بستی دھوپ	مدّون۔144ص
9	سلگتے حروف	مدّون۔128ص
10	ٹھنڈے سائے جلتے پیڑ	مدّون۔144ص
11	زخم اجالوں کے۔۔ہائیکو	مدّون۔144ص
12	خوشبو کی زنجیر۔۔ہائیکو	مدّون۔128ص
13	روشنیوں کے پیڑ۔۔ہائیکو	مدّون۔128ص
14	گلدستۂ قطعات۔۔قطعات	مدّون۔96ص
15	کالے بادل گوری بارش۔۔منظومات	مدّون۔96ص
16	اجلے چہرے کالے دل	مدّون۔96ص
17	پہلی پوڑی	مدّون۔128ص
18	تسمہ ٹبہ	مدّون۔128ص
19	جو کچھ کہا۔۔(کلیات،غزلیات ومنظومات)	مدّون۔2210ص
20	لوحِ دل۔۔بے نقط	زیرِ ترتیب
21	اک خالی کشکول۔فوق النقاط	زیرِ ترتیب۔
22	آدھی چھاؤں۔۔تحت النقاط	زیرِ ترتیب۔

مجموعہ ہائے نعت ومناقب

23	تفہیم الحسین (i)	مطبوعہ۔350ص
24	تفہیم الحسین (ii)	مدّون۔200ص
25	خطیبِ نوکِ سناں	زیرِطبع۔200ص
26	ارمغانِ حرم۔۔نعت	زیرِطبع۔128ص
27	سراجِ حرا (نعت)	مدّون۔128ص
28	جوازِ سُخن (نعت)	مدّون۔128ص
29	گہوارۂ آغوشِ رسالتؑ	مدّون۔128ص
30	سراجِ نہج البلاغہ	مدّون۔128ص
31	میں تیری دید کو ترستا ہوں	مدّون۔96ص
32	تیرا انتظار ہے	مدّون۔96ص
33	آ بھی جا	مدّون۔96ص
34	تو جو نہیں ہے	مدّون۔96ص
35	عبدِلا جواب (i)	مدّون۔96ص
36	عبدِلا جواب (ii)	مدّون۔96ص
37	لہو کی جیت (i)	مدّون۔96ص
38	لہو کی جیت (ii)	مدّون۔96ص
39	بکائے کرب وبلا (نوحہ جات)	مدون۔96ص
40	جو کچھ کہا (کلیات حصہ دوم) منقبات	مدّون 1220ص
41	نوحۂ لخت لخت۔۔مرثیہ	زیرِ ترتیب۔

تفہیم الحسینؑ
ایوارڈ یافتہ
شعیب جاذب
ارمغانِ حرم
شعیب جاذب
پیاسی چھاگل پیاسے لوگ
دھوپ کا سائباں
زبان زہر کی تلخی سے کھول بھی نہ سکوں
لبوں پہ سانپ بٹھا دو کہ بول بھی نہ سکوں
Nizami Arts 0333-6102461